

پرچھائیوں کا جنگل

اور دیگر افسانے

دیوی ناگرانی کے منتخب ہندی افسانے

انتخاب و ترجمہ

عامر صدیقی

پرچھائیوں کا جنگل

اور دیگر افسانے

دیوی ناگرانی کے منتخب ہندی افسانے

انتخاب وترجمہ

عامر صدیقی

فہرست

تعارف

دیوی ناگرانی۔ پیدائش: 11 مئی، 1941ء، کراچی، پاکستان۔ والد، کشن چند للوانی اور والدہ، ہری بائی لالوانی۔

تعلیم: بی عالم چائلڈ، ریاضی میں خصوصی ڈگری، نیوجرسی سے۔ مادری زبان، سندھی، زبانوں سے واقفیت: ہندی، سندھی، گرمکھی، اردو، تیلگو، مراٹھی، انگریزی، حال مقیم، نیوجرسی، امریکہ۔

شائع شدہ سندھی مجموعات:

غم میں بھیگی خوشی (غزل 2007)، اڑجا پنچھی (بھجناولی 2007)، آس کی شام (غزل 2008)، سندھ جی آؤں جائی آہیاں (کراچی 2009)، غزل (غزل 2012)، ماں کہں جوبی ناہیاں (کہانی 2016)، گلشن کور (کہانی 2018)، کتابی سمالو چنائیں (پریس میں)

ہندی مجموعات: چراغ دل (غزل 2007)، دل سے دل تک (غزل 2008)، لو دردِ دل کی (غزل 2008) بھجن مہیما (بھجناولی 2012)، ایسا بھی ہوتا ہے (کہانی 2016)، صحنِ دل (غزل 2017) گنگا نرنتر بہتی رہی (مختصر کہانیاں 2017)، کویتا کی پگڈنڈیاں (شاعری 2017)، ماں نے کہا تھا (شاعری 2017)، The Journey (انگریزی شاعری 2009)

ہندی سے سندھی تراجم:

بارش کی دعا(کہانی مجموعہ 2012)،اپنی دھرتی(کہانی مجموعہ 2013)،روحانی راہ جاپاندھیڑا(شاعری2014)، برف جی گرمائش(مختصر کہانی2014)، آمنے سامنے(ہندی سندھی شاعری تراجم2016)، آنکھ یہ دھنیہ ہے(نریندر مودی شاعری2017)، چوتھی کوٹ(وریم کاراکا کہانی مجموعہ)

سندھی سے ہندی تراجم:

سندھی کہانیاں(کہانی2014)، سرحدوں کی کہانیاں(کہانی2015)، اپنے ہی گھر میں(کہانی2016)، درد کی ایک گاتھا(کہانی2016)، ایک تھکا ہوا سچ(عطیہ داؤد کی شاعری2016)، وبھاجن کی تراسدی(کہانیاں2017)، کاویہ کی پگڈنڈیاں(شاعری2017)، احساس کے دریچے(غیر ملکی کہانیاں، ان پریس)، رومی مثنوی(انگریزی سے ہندی، اِن پریس)

دیگر تراجم:

سفر(انگریزی شاعری کا ہندی سندھی ترجمہ2016)سندھی کتھا(سندھی کہانی کا مراٹھی ترجمہ۔2016)، کئی کہانیاں مراٹھی، تیلگو، تمل، ملیالم، پنجابی، اردو وانگریزی میں ترجمہ ہوئی ہیں۔

اعزاز اور سمان: انٹر نیشنل ہندی کمیٹی، شکشایتن وودھیادھام سنستھا، نیویارک، کاویہ رتن سمان، کاویہ منی سمان" Proclamation ,Honor Award – Mayor NJ –Award سرجن شری سمان، رائے پور2008، کاویو تسو سمان، ممبئی2008، "انڈین لینگوئج کانفرنس" میں سمان، ممبئی2008، نیشنل سندھی لینگوئج ڈولپمنٹ کونسل ۔اعزاز2009، "خوش دلان جودھپور" سمان2010، آنریری ہندی لٹریچر آنر بائی ناروجین انفارمیشن اینڈ کلچر فورم، اوسلو2011، مدھیہ پردیش تلسی ساہتیہ اکادیمی سمان 2011، جیون جیوتی اعزاز، گنا تنتر دیوس ممبئی2012، ساہتیہ سیتو سمان۔ تمل ناڈو ہندی اکادمی 2013، سید امیر علی میر اعزاز مدھیہ پردیش نیشنل لینگوئج پروموشن کمیٹی 2013، ڈاکٹر امرتا پریتم لٹریری نیشنل ایوارڈ، ناگپور2014، لٹریری آنر ایوارڈ، کرناٹک یونی ورسٹی، دھارواڑ2014، ورلڈ ہندی سروس ایوارڈ، اکھل بھارتیہ منچیہ کوی پیٹھ، یوکے2014، بھاشا نتر شلپی سارسوت سمان بھارتیہ وانمیہ پیٹھ، کولکتہ جنوری2015،

ہندی سیوی سمان، اسمابی کالج، ترشور کیرالا ستمبر 2015، ہندی گورو سمان، ساٹھے کالج، ممبئ مارچ 2017، پرواسی ساہتیہ کار سمان، وشوبھاشا ساہتیہ اور رام کتھا انتر اشٹری سنگوشٹھی۔ دین دیال یونی ورسٹی، ساگر (م۔پ 2017)

☆☆☆

تعارف مترجم

عامر صدیقی، افسانہ نگار / مائکرو فکشنسٹ / مترجم / شاعر۔ پیدائش 20 نومبر 1971ء بمقام سکھر، سندھ۔ تعلیمی قابلیت ماسٹر، ابتدائی تعلیم سینٹ سیویئر سکھر، بعد ازاں کراچی سے حاصل کی، ادبی سفر کا آغاز ۲۹۹۱ئ میں اپنے ہی جاری کردہ رسالے سے کیا۔ ہندوپاک کے بیشتر رسائل میں تخلیقات کی اشاعت۔ افسانوی اور شعری مجموعہ زیر ترتیب ہیں۔ علاوہ ازیں دیگر تراجم و مرتبہ نگارشات کی فہرست مندرجہ ذیل ہے :

ا۔ فرار (ہندی ناولٹ)۔۔ رنجن گوسوامی، ۲۔ ناٹ ایکیول ٹولو (ہندی تجرباتی ناول)۔۔ سورج پرکاش، ۳۔ عباس سارنگ کی مختصر سندھی کہانیاں۔۔ ترجمہ: س ب کھوسو، (انتخاب و ترتیب)، ۴۔ کوکلاشاستر (ہندی کہانیوں کا مجموعہ) ۔۔ سندیپ میل، ۵۔ آخری گیت اور دیگر افسانے۔۔ نیناپال۔۔ (انتخاب و ترجمہ)، ۶۔ دیوی ناگرانی کی منتخب غزلیں۔۔ (انتخاب / اسکرپٹ کی تبدیلی)، ۷۔ لالٹین (ہندی ناولٹ)۔۔ رام پرکاش انت، ۸۔ دوڑ (ہندی ناولٹ)۔۔ ممتا کالیا، ۹۔ دوجی میرا (ہندی کہانیوں کا مجموعہ)۔۔ سندیپ میل، ۰۱۔ سترہ رانڈے روڈ (ہندی ناول)۔۔ رویندر کالیا، ۱۱۔ پچاس کی دہائی کی بہترین ہندی کہانیاں (۱۹۵۰ء تا ۱۹۶۰ئ)۔۔ (انتخاب و ترجمہ)، ۲۱۔ ساٹھ کی دہائی کی بہترین ہندی کہانیاں (۱۹۶۰ء تا ۱۹۷۰ئ)۔۔ (انتخاب و ترجمہ)، ۳۱۔ موہن راکیش کی بہترین کہانیاں (انتخاب و

ترجمہ)،۴۱۔ گنگا میا(ہندی ناول)۔۔ بھیرو پرساد گپتا،۵۱۔ قصہ کوتاہ(ہندی ناول)۔۔اشوک اسفل،۶۱۔ ہند کہانی ۔۔ جلد ایک۔۔(انتخاب و ترجمہ)،۷۱۔ ہند کہانی۔۔ جلد دوم۔۔(انتخاب و ترجمہ)،۸۱۔ ہند کہانی۔۔ جلد سوم۔۔ (انتخاب و ترجمہ)،۹۱۔ ہند کہانی۔۔ جلد چہارم۔۔(انتخاب و ترجمہ)،۰۲۔ شوکت حسین شورو کی سندھی کہانیاں۔ حصہ اول۔۔(انتخاب و ترجمہ)،۱۲۔ شوکت حسین شورو کی سندھی کہانیاں۔ حصہ دوم۔۔(انتخاب و ترجمہ)،۲۲۔ شوکت حسین شورو کی سندھی کہانیاں۔ حصہ سوم۔۔(انتخاب و ترجمہ)،۳۲۔ سورج کا ساتواں گھوڑا(مختصر ہندی ناول)۔۔ دھرم ویر بھارتی،۴۲۔ پہچان(ہندی ناول)۔۔انور سہیل،۵۲۔ سب رنگ۔۔ حصہ اول۔۔(مختلف زبانوں کی منتخب کہانیاں)،۶۲۔ سب رنگ۔۔ حصہ دوم۔۔(مختلف زبانوں کی منتخب کہانیاں)،۷۲۔ سب رنگ۔۔ حصہ سوم۔۔(مختلف زبانوں کی منتخب کہانیاں)،۸۲۔ دیس بیرانا(ہندی ناول)۔۔ سورج پرکاش،۹۲۔ انور سہیل کی منتخب کہانیاں۔۔(انتخاب و ترجمہ)،۰۳۔ تقسیم کہانی۔۔ حصہ اول۔۔(انتخاب و ترجمہ)،۱۳۔ سورج پرکاش کی کہانیاں۔۔(انتخاب و ترجمہ)،۲۳۔ ذکیہ زبیری کی بہترین کہانیاں(انتخاب و ترجمہ)،۳۳۔ سوشانت سپریہ کی کہانیاں۔۔(انتخاب و ترجمہ)،۴۳۔ منتخب پنجابی کہانیاں۔۔ حصہ اول۔۔(انتخاب و ترجمہ)،۵۳۔ منتخب پنجابی کہانیاں۔۔ حصہ دوم۔۔(انتخاب و ترجمہ)،۶۳۔ سوال ابھی باقی ہے۔(کہانی مجموعہ)۔۔راکیش بھرامر،۳۷۔ پرچھائیوں کا جنگل اور دیگر کہانیاں(دیوی نانگرانی کی منتخب کہانیاں)۔(انتخاب و ترجمہ)،۸۳۔ تقسیم کہانی۔ حصہ دوم سوم چہارم پنجم(زیر ترتیب)،۹۳۔ گناہوں کا دیوتا(زیر ترتیب)،۰۴۔ منتخب پنجابی کہانیاں حصہ سوم(زیر ترتیب)۔

☆☆☆

اور میں بڑی ہو گئی

شوخی اور چلبلا پن اس کی رگ رگ میں بسا ہوا تھا۔ اور جوانی کی طرح امنڈ امنڈ کر اپنا اظہار کسی نہ کسی صورت میں کرتا رہتا تھا۔ اس کی عمر بھی تو کچی تھی، اس کا لہجہ ہو یا بات کرنے کا انداز، اس کا اٹھنا ہو یا اس کا بیٹھنا، سب الھڑ پن سے بھرپور تھا۔

"میں اب کبھی دو چوٹیاں نہیں باندھ نہیں پاؤں گی، کیوں؟"

"کیونکہ تم بڑی ہو گئی ہو؟"

"تو کیا بڑے ہو کر دو چوٹیاں باندھنا منع ہے؟"

ارے منع نہیں ہے، ہر اک عمر کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں، رشتوں کے نام بدل جاتے ہیں، تو اپنے طور طریقوں اور "

"کو بھی تو تبدیل کرنا پڑتا ہے یا نہیں؟ ؛ برتاو □

"آپ کا مطلب ہے۔ رشتوں کے نام بدل جانے سے ہم بھی بدل جاتے ہیں یا جبراً بدل دیئے جاتے ہیں۔"

ارے بابا!!! تم سے بات کرنا بہت ہی مشکل ہے منی، بات کی کھال نکالنے لگتی ہو، بیٹا میں تمھیں نہیں سمجھاؤں گی یہ "اونچ نیچ کی باتیں تو اور کون آکر تمہیں دنیاداری کے یہ سلیقے بتائے گا۔

آپ چاہتی ہیں کہ دنیا کی سب لڑکیاں، جب عورتیں بن جائیں تو سب کچھ بھول جائیں، ہنسنا، مسکرانا، لنگڑی پالا کھیلنا، " کبڈی، توتو میں میں، وہ سب جو بچپن سے لے کر آج تک وہ کرتی رہی ہیں۔ سب کچھ چھوڑ دیں اور آپ کی طرح بن جائیں۔ دو پاٹوں کے درمیان پستی ہوئی۔ جیسے دھان کا کوئی دانہ۔ کیا ہر شادی کا اختتام ایسا ہی ہوتا ہے ماں، یہ شوہر کی ل دبانا، اس کے بچوں کو پالنا، کھانا بنا کر کھلانا، اسکول کے لئے تیّار کرنا ; خدمت کرنا، اس کے والدین کے ہاتھ پاو□ اور ان کی ضروریات اور مطالبات کی کشمکش میں گھرے رہنا، جیسے کوئی ٹوٹی پھوٹی ناؤ پھنسی ہو، کسی بڑے سے بھنور "کے درمیان۔

کیا کہہ رہی ہو منی، یہ تو باغی خیالات ہے۔ گھر کے لیے اپنا سب کچھ پیش کر دینا قربانی نہیں، یہ تو فرض ہوتا ہے، وہ" "میرے ہیں اور ان کا گھر بھی میرا ہے۔

یہ آپ کہہ رہی ہیں ماں، اب میں چھوٹی سی بچّی نہیں ہوں۔ جو یہ بھی نہ سمجھ سکوں۔ آپ جن کی بات کر رہی ہیں، وہ" میرے والد ہوتے ہوئے بھی میرے والد نہیں ہے۔ والد جیسا ان میں کچھ بھی نہیں ہے۔ انہیں یہ تک معلوم نہیں ہے کہ میں کس کلاس میں پڑھتی ہوں، کب میرا امتحان ہوتا ہے، کب گھر سے جاتی ہوں، کب آتی ہوں، میرا چھوٹا بھائی کس اسکول میں جاتا ہے، کیا کھاتا پیتا ہے، کیا پہنتا ہے، کیا اوڑھتا بچھاتا ہے۔ بس سال میں ایک دوبار اپنی خود غرضی بھری زندگی سے جب ہوش میں آتے ہیں تو پوچھ لیتے ہیں، " پڑھائی کیسے چل رہی ہے۔" اور اوپر سے مشورہ بھی دیتے ہیں، "گھر سے باہر زیادہ مت رہا کرو، ماں کی بات سنا اور سمجھا کرو۔" منی اپنی عمر کی باغی سوچ کو انڈیل کر کہتی رہی۔

"مُنی یہ آج کیا ہو گیا ہے تمھیں، جو اپنے من کے اس جو الا مکھی کی ان کہی تکلیف کو انڈیل رہی ہو۔" یہ کہتے ہوئے ماں کی آنکھوں میں ایک ان کہے درد کی پر چھائیاں بڑھنے لگیں۔

"ماں آپ تو ایسے کہتی ہیں، جیسے وہ کبھی آپکی بات سنتے ہیں اور مانتے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے انہیں اپنے نشے اور جوانی کی چوکھٹ پر بیٹھی میتری کے سوا کچھ یاد نہیں رہتا۔ کیا آپ اسی کو فرض کہتی ہیں، جو اب فقط یک طرفہ ہی رہ گیا ہے۔"

مُنی کہتی رہی اور ماں سنتی رہی، ماں کی زبان کو اب تالے لگ گئے۔ سچ ہی تو کہہ رہی ہے مُنی۔ دیکھنے میں وہ لاابالی ہے پر سمجھنے میں کافی صحیح۔ دسویں میں پڑھ رہی ہے، لیکن دنیاداری کو سمجھتے ہوئے بھی نہ سمجھنے کا دکھاوا کرتی ہے۔

مُنی اپنی ماں کی سکھی ہے، ان کے من کے اندر گہرائی میں، بہت گہرائی میں چلی جاتی ہے۔ اور وہاں پر جو زخموں کے چھالے ہیں، کبھی کبھار انہیں ایسی ہی باتوں سے پھوڑ آتی ہے۔ تاکہ ماں کے دل کا درد، زہر بن جانے سے پہلے، آنسو بن کر بہہ نکلے۔ انکے دل کی درد سے وہ بخوبی واقف تھی۔ مگر اپنی طرف سے لاعلم سی بنی رہتی ہے، لیکن نظریں اس گھر کی چار دیواری کے اندر اور باہر چاروں جانب منڈلاتی رہتی ہیں۔ جس دہلیز کی عزت کے سُر ماں کو الاپتے ہوئے سنتی، اسی کا رونا روتے ایک دن جانے کس بوجھ کو اپنے مہین آنچل میں نہ سنبھال پائی تو بیٹی کو پاس بٹھا کر کہہ بیٹھی۔۔۔

"بیٹا گھر کی بات گھر میں ہی رہے تو بہتر ہے۔ مجھے تیری بھی تو فکر لگی رہتی ہے۔ سال بھر میں کوئی اچھا لڑکا دیکھ کر تیری شادی کر دوں گی، پھر میری نیّا کا جو ہو سو ہو۔ تیرا بھائی تو لڑکا ہے۔ زندگی کے سفر میں مردوں کو بہت راستے ملتے ہیں، ڈال لیتے ہیں۔ دنیا اسے گوارا کر لیتی ہے، لیکن عورت کا ایک غلط قدم، ز بہت سے موڑ آتے ہیں، جہاں وہ اپنا پڑاو □ اسکی عزت کو خراب کر دیتا ہے۔ اسکو کلنک لگ جاتا ہے۔ جس کے بعد امیدوں کے سارے دروازے اپنے آپ اس پر بند ہوتے چلے جاتے ہیں۔"

اب ُمنی کچھ زیادہ غور سے سننے لگی اور سوچنے لگی کہ ماں کیوں ایسا کہہ رہی ہے اور کیا کہنا چاہ رہی ہے۔ جہاں اس کی سوچ، اس کی زبان کا ساتھ دینے سے کترا رہی ہے۔

گھر کے آنگن کو پار کرتے ہوئے میتری، پچھواڑے کے کمرے میں والد صاحب کے ساتھ بے دھڑک چلی گئی تھی، تب ماں کی اداسی مزید گہری ہوتی ہوئی دکھائی دی تھی۔ ُمنی کی گہری نظروں سے یہ سب چھپا نہیں تھا۔

"ماں آپ کس سلسلے میں بات کر رہی ہو؟ کون سا خوف دل میں پال لیا ہے مجھے بتائیں، شاید اپنے طریقے سے کچھ سوچ ں اور کسی نتیجے تک پہنچ سکوں۔" یہ کہتے ہوئے ُمنی نے اپنے ہاتھوں میں ماں کا چہرے اس طرح لے لیا، کہ ٖ پاو□ پل بھر کو اسے لگا جیسے وہ ماں کی ماں بن گئی ہو۔ اس پیار میں نرمی تھی، گرمی تھی، اپنا پن تھا۔

ں کے دریا میں ڈوبتی ہوئی نظر آئی۔ ٖ ُمنی۔" اور ماں آنسو□ "

"ماں کہیں نا، کیا بات ہے جو آپ چاہ کر بھی نہیں کہہ پا رہی ہیں، کچھ تو ہے، پر سچ مانیں ماں، آپ کے سائے میں بڑی ہوتے ہوتے اب میں اتنی چھوٹی بھی نہیں رہی کہ ان گہرے الفاظ کے معنی نہ سمجھ سکوں، لیکن آپکی زبان سے سننا چاہتی ہوں کہ کون سی بات آپ کے دل پر بوجھ ہے؟"

"بیٹی تمھارے والد تمہارے رشتے کی بات کر رہے تھے اور میں جانتی ہوں اِن رشتوں کی بنیاد کتنی کمزور ہوتی ہے۔"

وہ یہ سن کر سماعت سے محروم ہو گئی، ساری کائنات جیسے زمین پر رکھے اسکے پیروں میں سمٹ گئی ہو، جیسے کسی نے اسے سارے وجود کے ساتھ زور سے اچھال دیا ہو، کچھ اس طرح سے اسکا تن من بکھر گیا۔ سوچ نے ساتھ چھوڑ دیا لمحے بھر میں ہی اور وہ خالی آنکھوں سے ماں کی طرف دیکھتی رہی۔ نہ جانے کیا سوچ کر اس کا جسم اپنے بچپن کی ساری شوخیاں اور چلبلاہٹ بھول بیٹھا۔ اور اسے لگا کہ وہ اس عورت کا سایہ بن گئی ہے، جس نے اسے پیدا کیا ہے۔ کیا ورثے

میں اسے بھی یہی سب کچھ ملنے والا ہے، اس گھر کی چوکھٹ سے۔ اس سوچ سے وہ دہل سی گئی۔ دل ہی دل میں اپنے حوصلے کو تولتی رہی، سوچ کی تبدیلی کو محسوس کرتی رہی۔

بس کوئی لڑکا تلاش کر کے تیرے ہاتھ پیلے کرنا چاہتی ہوں اور یہ دعا کروں گی کہ اس گھر سے تو بہت دور چلی جا،"
"جہاں یہ زہریلی ہوائیں تیری سانسوں کو مسموم نہ کر سکیں۔

چر چر کی آواز کے ساتھ پرانے دروازے کا چرمراتا کواڑ کھلا اور اندر آنے والوں میں پہلے میتری اور ساتھ میں ایک نئے نوجوان کا چہرہ نظر آیا، جو اپنی گرسنہ نظریں منی پر ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ آنگن کے اس پار والے کمرے میں والد صاحب نے کچھ اوطاق جیسا ماحول بنا رکھا تھا۔ پان دان، بیڑیوں کے پیکٹ، ماچس کی تیلیاں اِدھر اُدھر بکھری تھیں۔ بھری اور خالی بوتلوں کی بو سے کمرے کی فضا بوجھل ہوتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی ماں کو لاتوں سے مار کر اس کی صفائی کی تاکید کرتے ہوئے سنا ہے، لیکن ماں وہ کام کب کرتی ہیں۔ یہ میں نے کھلی آنکھوں سے کبھی نہیں دیکھا، لیکن جانتی ہوں، ہماری پلکوں میں نیند بھر جانے کے بعد وہ کرتی رہی ہوں گی، یہ ہیں ماں۔

سوچ کے بھی ڈر لگنے لگتا ہے کہ اے عورت کیا یہی تیری کہانی ہے؟ کیا ان بے زبان زخموں کو دیکھ کر آدم کا دامن آہوں سے نہیں بھرتا؟ اور ایسے کئی واقعات کو دیکھ کر، انہیں محسوس کرتے ہوئے اسے لگ رہا ہے۔ جیسے خود وہ دور جی رہی ہے۔ ان درندوں کے چنگل کا شکار بن کر، جن میں انسانیت کا نام و نشان تک باقی نہیں۔ پر آج جو حادثہ ہوا، !! اس کے گزرنے کے بعد اب میں بڑی ہو گئی ہوں

وہیں اس چوکھٹ پر اسکا بچپن لٹ گیا، اس کی معصومیت لٹ گئی۔ وہ کھکھلاہٹ، وہ چلبلاہٹ، سب اس حیوانیت کے آگے گھٹنے ٹیک کر رہ گئیں۔ شاید جانور بننا زیادہ آسان ہے۔ انسان تو صرف قیمت ادا کرنے کے لیے ہوتا ہے۔

☆☆☆

صلح

آج اس نے من کی کرنے کی ٹھان لی۔ بس بہت ہو گیا، ہر بار پیار محبت کی چکنی چپڑی باتوں سے بہلا پھسلا کر، اسے مستقبل کے سہانے خواب دکھا کر اسے صلح کرنے پر مجبور کر دیتا تھا منجیت۔ لیکن آخر کب تک؟

ماں تھی وہ اور وہ امیر زادہ ہوا تو چہ معنی دارد؟ وہ اپنوں سے دور ہوئی، تو کیا ہوا؟ کیا قریب یا دور رہنے سے رشتوں کے مطالب بدل جاتے ہیں؟ اسی الجھن بھری کشمکش سے گذرتے ہوئے وہ، رات بھر کروٹ بدلتے بدلتے خود سے پوچھے ہر سوال کا جواب طلب کرتی رہتی۔

راہول اسکی پہلوٹھی کی اولاد، سات مہینے کا ہونے کو آیا تھا اور ابھی تک اسے وہ اپنی ماں سے نہیں ملوا پائی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں طے کر لیا تھا کہ اب وہ کسی بھی حال میں نوکری نہیں کرے گی۔ اپنے بچّے کی پرورش اور دیکھ بھال خود کرے گی، دوسری صورت میں وہ بدیس چھوڑ کر اپنے ملک ہندوستان لوٹ جائے گی، جہاں کی مٹّی اسے اپنی آغوش میں لینے کی منتظر تھی۔

....

اسی نگوڑی نوکری کے لئے وہ اپنے ننھے بچّے کو صبح آٹھ بجے سے شام چھ بجے تک "بے بی ڈے کیئر" میں چھوڑ دیتی ہے، جہاں اسکی دیکھ بھال کی مد میں ہفتے کے تین سو ڈالر کی خطیر ادائیگی کر رہی ہے۔ باوجود اسکے پیر سے جمعے تک، ہر روز بڑے لگے بندھے اصولوں کے تحت، ساڑھے سات بجے سارے دن کے لئے درکار ضروری اشیاء یعنی کھانا، جوس، کھلونے، تبدیل کرنے کے لئے کپڑے، سبھی کچھ ایک باسکٹ میں بھر کر کار میں رکھنے کے بعد وہ خود تیار ہو کر بچّے کو بڑے دکھ سے اٹھاتی۔ ممتا چاہتی کہ بچّہ کچھ پل اور سو لے، لیکن مجبوری کا احساس کرتے ہوئے بچّے کو اٹھا کر جیسے تیسے صاف کر کے تیار کرتی، موسم کی مناسبت سے کپڑے پہناتی، پاؤڈر وغیرہ لگا کر کپڑے بدلتی، ایک بوتل دودھ کی لے کر اسے کار کی سیٹ میں بٹھاتی۔ گرمی ہو یا سردی، برسات ہو یا برفباری۔ یہ سلسلہ پچھلے تین مہینوں سے جاری ہے۔ تین مہینے تو "میٹرنٹی لیو" رہی، چار مہینے سے دونوں میاں بیوی نے صبح شام کی مل بانٹ کر ذمے داری لے لی۔ ایک صبح یہ کام سنبھالتا تو دوسرا رات کی ڈیوٹی سر انجام دیتا۔ اور اسی جاگنے اور سونے کی کشمکش میں دونوں اکثر سوالوں جوابوں کی قطار میں الجھے رہتے۔

اپنی نادانی پر شرمندہ ہوتے ہوئے وہ محسوس کرتی کہ پندرہ سو ڈالر کماتے ہوئے بھی وہ اپنے ادھورے پن کے احساس کو خود سے الگ نہیں کر پا رہی ہے۔ نہ مکمل طریقے سے ماں بن پائی ہے اور نہ ہی ایک اچھّی استاد۔ سبب اسکا اپنا بٹوارہ، اپنے بچّے اور اسکول کے بچّوں کے بیچ۔ ایک اسکول میں ٹیچر تھی وہ۔

بچّے کو گود میں اٹھا کر ڈے کیئر پہنچتے ہی، اندر جا کر، انچارج کے ہاتھوں میں اپنا بچہ سپرد کرتی اور ساتھ میں اسکی ضرورت کی سبھی اشیاء اسے دیتے ہوئے بچّے کا بوسہ لے کر اپنے کام پر روانہ ہو جاتی۔ لیکن اسکا دل وہیں کہیں، بچّے کے آس پاس منڈراتا رہتا، بھٹکتا رہتا۔ شام چھ بجے لوٹتے وقت بھی یہی سلسلہ، بچّے کو لینا، اسکے سامان کو سمیٹنا، سنبھال کر اٹھانا، کبھی بچہ سویا ہوتا، تو کبھی بیدار، کبھی ہنستا ہوا تو کبھی روتا ہوا۔ ان سبھی مشکلات سے اسے اکیلے ہی نپٹنا پڑتا۔ اب یہ سلسلے وار اور منظم دستور العمل اسے ناگوار سا گذرنے لگا تھا۔ ماں کی ممتا امنڈتی تو تھی، پر وہ اپنا پیار چھلکائے تو کس

پر؟ تمام دن بچّہ اوروں کے حوالے اور دوسروں کے بچّے اسکے سپرد۔ اسکول کے بچّوں کو پڑھاتے ہوئے اسکی آنکھوں کے سامنے اپنا بیٹا راہول آجاتا۔ کبھی ڈے کیئر کے جھولے میں بسورتا ہوا، کبھی روتا ہوا، کبھی بلکتا ہوا۔ وہ بس سوچتی رہتی، کیا سولہ ننھی معصوم جانوں کو صرف دو عورتیں سنبھال پاتی ہوں گی؟ انھیں چھاتی سے لگا کر، لوری سنا کر سلا پاتی ہوں گی؟ یہ ممکنات سے نہیں لگتا تھا۔

ایڈمشن لینے کے بعد، ڈے کیئر کے اصول و قواعد کے مطابق، پہلے تین دن ماں یا باپ کا بچّے کے ساتھ رہنا لازمی تھا، تاکہ بچہ ماں کے آنچل یا باپ کی آغوش میں رہتے ہوئے اسکول کے اجنبی ماحول کو پہچان سکے۔

یقیناً مادھوری کا اپنا وقت جیسے سمٹنے لگا۔ ایک گھنٹا پہلے اور ایک گھنٹا آفس کے بعد، ڈے کیئر سے گھر آنے جانے میں لگتا۔ گھر پہنچتے ہی پہلے کچن جاتی، سبزی، چاول یا چپاتی بناتی، پھر بچّے کو گرم پانی سے نہلاتی، پاؤڈر لگا کر صاف ستھرے کپڑے پہناتی، تب کہیں جا کر وہ پلنگ پر بیٹھ کر اسے گود میں اٹھا کر، اپنے دودھ کے بجائے بوتل کا دودھ پلاتے ہوئے اسے دیکھ دیکھ کر مسکرانے کی ناکام کوشش کرتی۔

جب بچّہ پیدا ہوا، تین ماہ وہ گھر میں تھی، خوش تھی۔ بچّے کے ساتھ وقت گذارتے، اپنی ممتا لٹاتے اور اسکی دیکھ بھال کرتے ہوئے مسرور و فرداں ہوتی، پر جب سے کام پر لوٹنے کے دن آئے، ہنسی تو جیسے اسے الوداع کہہ گئی۔ کبھی کبھی اسکا دل باغی بن جاتا۔ کیوں بچّے کی پرورش میں، اسکی دیکھ بھال کرنے میں، فقط ماں کا حصہ ہو؟ کیا باپ کا حصہ صرف اسکی ولدیت اور نام کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ ماں کی کوکھ میں پنپنے والی نازک کونپل کو، پیار سے سینچنا کیا فقط ماں کا فرض ہے؟ کیا باپ صرف گھر کا مالک ہوتا ہے، وہ جو چاہے کرے، جو فیصلہ کرے وہی حکم بن جائے۔

اسی سوچ کی بنیاد پر پہلے بھی کئی بار ان دونوں میں بحث و تکرار ہوئی ہے۔ مادھوری اپنے شوہر منجیت سے ہمیشہ ہی ہار جاتی، بس تھکی ہاری ہوئی ایک شریکِ حیات، ایک ماں بھر ہو کر رہ جاتی۔

"تم نوکری چھوڑو گی تو یہ گاڑی کیسے چلے گی؟ گھر کا کرایہ، دو گاڑیوں کا پریمیم، ہیلتھ انشرنس کا پریمیم، بچّے کا تین سو ڈالر ملا کر لگ بھگ سات آٹھ سو ڈالر کے اخراجات ہیں۔ کم سے کم اسکے بعد سات سو ڈالر تو بچتے تو ہیں۔ اگر یہ آمدنی نہ ہو گی تو کیا ایک کی کمائی سے اس گھر کی گاڑی چل پائے گی؟ تین لوگوں کا گذارہ ہو پائے گا؟"

"لیکن میں ایسی بٹی ہوئی زندگی کب تک گزاروں گی منجیت؟" مادھوری غصے میں پوچھ بیٹھتی۔

"کیا مطلب! میں کچھ بھی نہیں کرتا؟ تمھاری طرح صبح ساڑھے آٹھ بجے گھر سے نکلتا ہوں اور رات کو نو بجے گھر لوٹتا ہوں۔ لیکن یہاں بھی ایک پل سکون کا نصیب نہیں ہوتا۔ تم نے کبھی سوچا ہے کہ میں کیسے خود کو مار کر جیتا ہوں۔ اپنی تمنّاؤں کا گلا گھونٹ کر بے حس ہوتا جارہا ہوں۔"

"منجیت یہ تو تمھارا اپنا فیصلہ تھا کہ ہم یہاں آکر مقیم ہو جائیں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ ہم اپنے ملک سے، اپنوں سے دور، زندگی تو نہیں، ہاں البتہ اسکی سزا ضرور بھگت رہے ہیں۔ بچّے کو سردی ہو یا بخار، کھانسی ہو یا جلاب، اسے "ڈے کیئر" تو چھوڑنا ہی ہے، کیونکہ مجھے کام پر حاضر ہونا ہوتا ہے۔ ہندوستان میں تو لوگ اپنے بچّوں کو گہوارے میں جھولا جھلا کر، لوریاں گا کر سلاتے ہیں۔ وہاں دادا دادی، نانا نانی اپنی پوتے پوتیوں کو لاڈ پیار سے پچکار کر کھلاتے پلاتے ہیں، کہانیاں سنا کر انکا دل بہلاتے ہیں۔ لیکن یہاں تو ہمارے سوا، راہول کا کوئی بھی نہیں؟ ہم دونوں بھی اپنے اپنے کام پر ہوتے ہیں اور راہول اوروں کے سپرد۔ مجھے پانچ سال تک کی مہلت چاہیئے کہ میں اپنے بچّے کی پرورش کر سکوں، پیار کے پانی سے سینچوں، اس پر اپنی ممتا نچھاور کروں، اسکی توتلی بولی سنوں، اسکے مسکراتے چہرے کو دیکھ کر مسکراؤں۔ یہ سب کیا ہوتا ہے یہ تو میرے لئے جیسے خواب سا ہو گیا ہے۔"

"یہ تو ہے، پر جب وہ کچھ بڑا ہو گا، تو ہم کچھ کرنے کی حالت میں ہو سکتے ہیں۔ ابھی تو گرہستی کی ضروریات پوری کرنا ہی ہماری مقصدِ حیات ہے، جسکے لئے ہم دونوں کا کام کرنا نہایت ضروری ہے۔" اتنا کہہ کر منجیت جیسے کسی سوچ میں گم ہو گیا۔

ہم بچّے کو پیار اور وقت ابھی نہیں دے سکیں گے تو بڑا ہو کر ایسی نامناسب پرورش کے عوض وہ کِھل نہیں پائے گا۔" اور اب میں بھی خود کو ادھورا محسوس کرنے لگی ہوں۔ منجیت، مجھے لگتا ہے کہ میں نوکری چھوڑ کر اس معصوم کی پرورش خود کروں، شاید میرے پیاسی ممتا کو کچھ طمانیت ملے، اور ہمارا بچہ بھی پیار سے پل جائے۔"

"میں سب کچھ سمجھ رہا ہوں مادھوری، لیکن۔۔۔" ابھی منجیت اتنا کہہ ہی پایا تھا کہ مادھوری نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا، "منجیت ہماری یہ گھریلو زندگی اگر پیار اور اعتماد کی بنیاد پر نہیں ہے، تو ہم ساتھ ہوتے ہوئے بھی ساتھ نہ ہونگے۔ دل میں دراڑیں اپنا وجود بنالیں گی۔ دلوں میں دوریاں آتی رہیں گی۔ کیا تم چاہتے ہو کہ ہم اپنی اس دنیا کی بنیاد مایوسیوں پر رکھیں؟ تم تین سال اکیلے نوکری کرو، پھر چاہے میری کار بیچ دو، بھلے ہی گھر چھوٹا لے لو۔۔۔ میں گھر میں بیٹھ کر کچھ کر پائی تو ضرور کروں گی، لیکن یہ موقعہ جو مجھے ملا ہے اس میں مجھے تمھارا بھرپور تعاون چاہئے تاکہ میں بچّے کو اپنی محبت، اپنا پیار دے پاؤں، اس میں انسانیت کا بیج بو پاؤں، اسکے بڑا ہونے تک اسکی پہچان کی بنیاد رکھ پاؤں۔ آج اگر ہم بچّوں کے بچپن کے ساتھی بنیں گے تو کل بڑا ہو کر وہ ہمارے بڑھاپے کا ساتھی بنے گا۔ یہ رشتے نہیں، دلوں کے تار ہیں، کھینچا تانی سے ٹوٹنے لگیں گے۔ منجیت پلیز مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں اس پہلی تاریخ کو نوکری چھوڑنا چاہتی ہوں اور اگر تمھیں یہ بات بالکل بھی منظور نہیں ہے، تو پھر میں ایک فیصلہ کروں گی۔ میں بچّے کے ساتھ ہندوستان چلی جاؤں گی۔" یہ سب کہتے ہوئے مادھوری کی آنکھوں میں آنسو بے اختیار ہی نمودار ہو گئے۔

منجیت چپ تھا، ایک دم خاموش۔ بات اسکے دل تک دستک دے گئی۔ سچ ہی تو ہے، جب وہ اپنی ماں سے دو تین سال بعد ملنے ہندوستان جاتا ہے، تو وہ محسوس کرتا ہے کہ ماں اسکی جانب دیکھتے نہیں تھکتی، اسکی بلائیں لیتے لیتے ممتا میں نہا جاتی ہے اور جب امریکا لوٹنے کے دن قریب آتے تو کیسے وہ گھائل پنچھی کی طرح اپنے زخموں کی تکلیف، اپنے اندر دبا لیتی۔

منجیت، مادھوری کی سوچ اور سخت فیصلے کو سن کر چپ ہو گیا۔ اس نے اپنی ماں کے دل کو توڑا تھا اور اب اپنے بیٹے کی ماں کا دل نہیں توڑ سکتا تھا۔ آخر خاموشی کو تحلیل کرتے ہوئے منجیت نے کہا۔" مادھوری، سچ کہہ رہی ہو تم، چلو یہ پرایا ملک چھوڑ کر، غیروں کو چھوڑ کر، اپنوں کے پاس اپنے ملک چلتے ہیں۔ ہمارے بچّے کو ہمارے پیار کی ضرورت ہے، ہم دونوں کو ایک دوسرے کے پیار اور ساتھ کی طلب ہے۔ چلو امیدوں کی ڈور پکڑ کر ہم آگے بڑھیں، جہاں خوشی مسکرا کر ہمارا خیر مقدم کرنے کو بے قرار ہے۔ میری اور تمہاری ماؤں کی پھیلی ہوئی بانہیں راہول کو اپنے آنچل میں لے لیں گی اور ہم ایک دوسرے کے مددگار بن کر اس گھر کو ایک نیا روپ دیں گے، جہاں خوشیوں کی بارشیں ہوں گی اور نئے نئے پھول مہکیں گے۔"

خوشیوں بھرے اس فیصلے پر دونوں کی صلح ہوئی۔ دونوں کے دل طمانیت کی ایک نئی کونپل نمودار ہونے کی امید لئے، وطن کی جڑوں میں جم جانے کی چاہ کے ساتھ، اڑان بھر رہے تھے۔

☆☆☆

پرچھائیوں کا جنگل

ماں کو بڑی مشکل سے سہارا دے کر بس میں چڑھایا اور پھر میں سوار ہوئی۔ بس دھچکے کے ساتھ آگے بڑھی تو ماں گرتے گرتے بچی۔ میں بھی اسے نہ سنبھال پائی۔ ایک مہربان ادھیڑ عمر شخص نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اسے بیٹھنے کے لئے کہا اور ماں ایک فرمانبردار بچے کی طرح سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں نے ٹکٹ لیا اور اس کے ساتھ چپک کر کھڑی ہو گئی۔ "ٹینک بنڈ" بس اسٹاپ پر اترنا تھا۔ کنڈکٹر نے دو بار زور سے پکارا۔۔

"ٹینک بنڈ، ٹینک بنڈ"

لیکن میں ماضی کے خلاؤں میں کھوئی رہی، جب اسی طرح سہارا دے کر ماں نے مجھے پہلے چڑھایا تھا اور بعد میں وہ خود سوار ہوئی تھی۔ بس چلنے لگی تھی، مگر پھر پتہ چلا ہے کہ کچھ چھوٹ گیا تھا، کچھ نہیں بہت کچھ چھوٹ گیا تھا۔ والد صاحب جو ساتھ آئے تھے، وہ پیچھے رہ گئے تھے۔ جلد بازی میں وہ چڑھ ہی نہیں پائے یا۔۔۔! ماں زرد چہرے، پھٹی پھٹی

آنکھوں اور گم صم سی کیفیت میں بڑبڑاتی ہوئی، اچانک چلانے لگی، "ارے بس روکو، بس روکو، منیا کے بابا پیچھے رہ گئے "ہیں۔ ارے بھائی روکو مجھے اترنے دو، وہ پیچھے رہ گئے ہیں۔

ں سے باتیں کرتی ٹینک بنڈ بس اسٹاپ پر آکرہ نحیف سی آواز، بس کے شور میں دھندلا سی گئی اور بس ہوا و□ ں زمین پر ٹک نہ ہ ٹھہری۔ ماں نے ایک طرح سے مجھے دھکا مار کر نیچے اتارا اور خود جیسے چلتی بس سے کود پڑی۔ پاو□ پائے تو وہ اوندھے منہ زمین پر گر پڑی، وہیں بس اسٹاپ پر، لوگوں کی بھیڑ کے درمیان۔ جیسے کوئی تماشہ ہو مداری کا! لوگ چلتے چلتے، مڑ مڑ کر ترچھی نگاہوں سے اس کی طرف گھورنے لگے۔ سوچتے ہوں گے یہ کیسا پاگل پن ہے کہ بس ابھی رکی بھی نہیں کہ یہ کود پڑی۔ ویسے۔۔۔ تب میں آٹھ سال کی تھی اور آج اٹھارہ کی ہوں، پہلے سے زیادہ سمجھ سکتی ہوں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تب میں نے زمین پر گری ہوئی ماں کا ہاتھ تھاما تھا اور کھینچتے ہوئے اسے اٹھانے کی ایک کمزور سی کوشش کی تھی۔ ماں اٹھی تھی اور بس کی مخالف سمت میں تقریباً بھاگنے سی لگی تھی اور اس کا ہاتھ تھامے ہوئے میں بھی اسی رفتار سے ساتھ ساتھ کھنچی چلی جا رہی تھی۔ اتنا تو میں سمجھ ہی گئی تھی کہ ماں پیچھے چھوٹ گئے میرے والد کی تلاش میں اس جانب بھاگے جا رہی تھی۔

ماں رکو تو، میں نہیں دوڑ سکتی۔ مجھے درد ہو رہا ہے۔" میری روہانسی سی آواز، ایک بار پھر شور کے بادلوں میں کھو گئی۔"

" اری چل، جلدی چل۔۔۔ تیرے والد نہ جانے کہاں چلے گئے ہوں گے ؟'

""کہاں گئے ہوں گے ماں، کہیں نہیں جائیں گے، گھر واپس آ جائیں گے۔ "

""!اری اب چپ بھی کر، بس جلدی چل۔ تُو نہیں جانتی "

اس کے آگے ماں کچھ نہ کہہ سکی۔ آج اسکی خاموشی کا مطلب، میری سمجھ میں آ رہا ہے۔ جو نہیں جانتی تھی، اب جاننے لگی ہوں۔ تب آٹھ کی تھی، اب اٹھارہ کی ہوں۔ دس سالوں میں اپنوں کا درد، ان کے احساسات، انکی خاموشی میں

چڑھتے اترتے، جوش کھاتے لاوے کو خوب سمجھتی ہوں، ان کے جذبات کی ہر آہٹ کو دستک دیتے ہوئے محسوس کرتی ہوں۔ بڑی ہوتے ہوتے، حقیقت میں بڑی ہو گئی ہوں میں، تبھی توماں کو ایک بچے کی طرح ہاتھ سے پکڑ کر پہلے بس میں چڑھایا اور پھر خود سوار ہوئی۔

ٹینک بنڈ، ٹینک بنڈ" کنڈکٹر نے دوبارہ آواز دی۔"

میں نے ہڑبڑا کر ماں کا ہاتھ پکڑا، اسے سہارا دے کر اتارنے کے بعد خود اتری، اور اس کا ہاتھ تھامے ہوئے ہی بس میں چڑھنے اور اترنے والے لوگوں کی بھیڑ سے بھڑ گئی۔ ہاتھ چھوڑنے کا خطرہ میں نہیں لے سکتی تھی، بالکل بھی نہیں۔ زندگی کے اتار چڑھاؤ بھی اونٹ کی طرح کروٹ بدلتے،، ہچکولے کھاتے، زندگی کی کشتی کو آگے دھکیلتے رہتے ہیں، ٹھیک اسی طرح جیسے دس سال پہلے ماں مجھے تقریباً دھکیلتے ہوئے، اپنے ساتھ گھسیٹتے ہوئے، پاگل پنے کی حد تک، والد صاحب کو تلاش کر رہی تھی۔ یہ سچ ہے کہ جب ماں نے کہا تھا، "تُو نہیں جانتی۔" حقیقت میں میں نہیں جانتی تھی کہ والد صاحب گھر نہیں جائیں بلکہ کہیں اور چلے جائیں گے۔ انسان کا ٹھکانہ تو اس کا گھر ہوتا ہے۔ کیا کوئی بھولا بھٹکا، تھکا ہارا، بھوکا پیاسا انسان کسی نامعلوم ڈگر پر گمراہ ہو جاتا ہے یا اس طرح بھی کھو جاتا ہے، جیسے میرے والد کھو گئے تھے اُس دن؟ گھر کے نزدیک آکر ماں نے کنڈی کھولی اور اندر جھانکا، والد صاحب وہاں نہیں تھے۔ ہوتے بھی کیسے؟ کنڈی ل کس سے ہ تو باہر سے بند تھی، ماں نے ہی کھولی تھی۔ "اے بھگوان کہاں گئے ہوں گے؟ اب میں کہاں جاو□ پوچھوں؟ انہیں تو اپنی خبر نہیں ہوتی، نہیں تو گھر نہ لوٹ آتے۔" اور ماں بلک بلک کر اپنا ماتھا پیٹنے لگی۔

میری معصومیت شاید اس درد کو، اس کے مفہوم کو پوری طرح نہ جانتے ہوئے بھی سسک سسک کر رونے© © لگی تھی۔ آج جانتی ہوں ماں نے وہ سفر کیسے تنہا کاٹا ہو گا، کس طرح اکیلے اکیلے اس درد کے صدمے کو سہا ہو گا، جس نے قطرہ قطرہ اسے رلایا۔ میں نے تو بس ساتھ دیا تھا۔ آج بھی وہ گھر کے کسی کونے میں خاموشی سے بیٹھے بیٹھے بے رحمانہ زندگی کے نجانے کن کن قصوں کا حساب کتاب جوڑتی رہتی ہے۔ دیکھ کر میرا رواں رواں کانپ اٹھتا ہے۔ کیا

بے بس آدمی کچھ بھی نہ کر پانے کی حالت میں کچھ ایسا بھی کر بیٹھتا ہے یا اپنے آپ ایسا ہو جاتا ہے۔ سارا بدن کانپ گیا ۔۔۔ فقط یاد کرنے سے ہی۔ کپکپاہٹ تو تب بھی ہوئی تھی، جب ماں نے میرا ہاتھ جھٹک کر خود کو چھڑایا تھا اور ایک دلدوز چیخ کے ساتھ بھیڑ کو چیرتی ہوئی والد صاحب کی لاش پر جا جھکی تھی۔ جھکی کیا، ان پر گر ہی پڑی تھی۔ ان کے پیچھے پیچھے جاتے ہوئے میں نے وہ نظارہ آنکھوں کے سامنے دیکھا تھا، خون سے لت پت والد صاحب زمین پر پڑے تھے۔ تب نہیں جانتی تھی، لیکن اب بخوبی واقف ہوں۔ کسی موٹر کار نے انہیں ٹکر ماری تھی، وہ خود کو نہ سنبھال پائے اور نیچے گر پڑے۔ بس لمحے بھر میں ہی زندگی کی سرحد پار کر کے موت کی حدود تک جا پہنچے۔ کتنی باریک لکیر زندگی اور موت کو ایک دوسرے سے تقسیم کرتی ہے! جو ہونا تھا وہی ہوا۔ بعد میں جو ہوا وہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ماں جب بھی مجھے اپنے سامنے موجود پاتی، والد صاحب کی یاد میں پل پل جینے، پل پل مرنے کی ساری کہی ان کہی باتوں کو دوہراتی، جو درد بن کر ان کے دل میں سما گئی تھیں۔ والد صاحب کو ذہنی بیماری نے اپنا شکار بنالیا تھا اور وہ آہستہ آہستہ سب کچھ بھولتے جا رہے تھے، اپنے وجود کو بھی۔ تب میں دو سال کی تھی، ایسا ماں نے بتایا۔ اور اس حالت میں وہ نہ مجھے تنہا چھوڑ سکتی تھی نہ والد صاحب کو۔ ہمیشہ گھر کی کنڈی اندر سے بند رکھتی تاکہ والد صاحب کبھی بھولے سے بھی دروازہ کھول کر باہر نہ نکل جائیں۔ کبھی والد صاحب کو لے کر ڈاکٹر کے پاس جانا ہوتا تو مجھے بھی ساتھ لے لیتی، کیونکہ میں چھوٹی تھی۔ آفتاب میرا بڑا بھائی تھا، آج ہوتا تو بائیس سال کا کڑیل نوجوان ہوتا۔ مجھ سے وہ چار سال بڑا تھا۔

وہ ہوتا تو یہ سب کچھ نہ ہوتا، بھگوان کو اس کی زیادہ ضرورت رہی ہوگی، تبھی تو۔۔۔!" ماں ایسا بار بار کہتی رہتی۔ آج" کل وہ ہر بات بار بار دوہراتی ہے اور پرانی یادوں کی پوٹلیوں سے بھولی بسری باتیں ادھیڑ کر مجھے سناتی رہتی ہے۔ اب تو لگتا ہے کہ جب میں اس کے پاس نہیں بھی ہوتی ہوں تب بھی وہ بڑبڑاتی ہی رہتی ہے، پھر چاہے کوئی سن رہا ہو یا نہیں سن رہا ہو۔ میرے پاس بھی کوئی چارہ نہیں۔ اسکا بھرم برقرار رکھنے کی خاطر شاید اس درد بھرے پھپھولوں کو پھوڑ کر انہیں قطرہ قطرہ بہنے پر مجبور کرتے ہوئے پوچھ لیتی ہوں، "ماں، والد صاحب اس دن تم سے کیوں خفا ہو گئے تھے اور

ناراض ہو کر کیوں برس پڑے تھے؟ بتاؤ نہ ماں کیوں۔۔۔؟"   ایسے میں ماں ایک طویل سانس لے کر مجھے شروع سے آخر تک وہ قصہ سناتے ہوئے کہتی، "ارے منی تجھے پتہ ہے، اس دن تیرے باپ نہانے کے لئے غسل خانے گئے، ہاتھ میں رومال اور پاجامہ لئے، جس کا ازاربند لٹک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد غسل خانے سے ناراضگی بھری آوازیں آنے پر میں دوڑتی ہوئی وہاں پہنچی۔ وہ آئینے میں دکھائی دینے والے اپنی پرچھائیں سے لڑ رہے تھے اور لٹکتے ہوئے ازاربند کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ وہی عمل پرچھائیں بھی کر رہی تھی۔"

"ایسا کیا ہوا تھا ماں؟" میں نے ماں کے دل کو پھر ٹٹولا۔

"منی، پتہ ہے انہیں غصہ کس بات پر آ رہا تھا؟"

"نہیں ماں!" میں صرف اتنا ہی کہہ پائی۔ درد کو نگلنا اتنا مشکل ہے تو ہضم کر پانا کتنا ناقابل برداشت ہو گا، یہی سوچتی رہی۔

"اری پگلی، پاگل پنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ گھر میں کوئی چور گھس آیا ہے اور ان کا رومال اور پاجامہ چھین کر لے جانا چاہتا ہے۔ وہ انہیں اپنے طرف کھینچ رہے تھے اور پرچھائیں اپنی طرف۔۔۔!"

"پھر کیا ہوا اماں؟" میں نے اپنے آنسو روکتے ہوئے ایسے پوچھا، جیسے اس کہانی کا اختتام جاننے کے لئے بیقرار ہوں۔

"میں نے یہ دیکھ کر فوری طور پر غسل خانے کی لائٹ بند کر دی اور ان کا ہاتھ تھام کر کمرے تک لے آئی اور تسلی دیتے ہوئے ان سے کہا کہ اب چور بھاگ گیا ہے، وہ پھر کبھی نہیں آئے گا۔" ماں نے اپنی آنکھیں دوپٹے کے کونے سے پونچھتے ہوئے اس قصے کو انجام تک پہنچایا۔

"کبھی نہیں آئے گا، مجھے تنگ بھی نہیں کرے گا؟" یہ والد صاحب کے الفاظ تھے یا ان کا ڈر تھا، یہ نہ ماں آج تک سمجھ پائی، نہ مجھے سمجھا پائی ہے۔

"نہیں کبھی نہیں!اب آپ لیٹیں اور سونے کی کوشش کریں۔"

ایسی حالت میں ماں کا تنہا جدوجہد کرنا، میری زندگی کا حصہ بنتا گیا۔ ایسے اور اس جیسے بہت سے دیگر واقعات، جنہیں آج بھی یاد کرتے ہوئے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیا انسان اپنی یادداشت کے ساتھ ساتھ اپنی پہچان بھی اس قدر کھو دیتا ہے کہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ کیا وہ کسی کاغذ کی کشتی میں سوار ہے؟ کیا اس میں بھی چھید ہیں، جہاں سے درد دھیرے دھیرے رستا ہوا دماغ کے اندر گھس جاتا ہے؟ کیا کوئی مشین یا طریقہ نہیں، یا کوئی ایسا بند، جو بندھ جائے تاکہ درد قطرہ قطرہ بہہ کر دماغ کو خالی کر دے۔ یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ آدمی زندہ ہو پر جیتا نہ ہو، مرنے والے کی یاد میں خود کو بے خبری کے عالم تک لے آئے۔ ایسی زندگی باپ کے بعد میں نے ماں کو جیتے ہوئے دیکھی اور ساتھ رہتے رہتے خود بھی جی اور بھگتی۔ ایک دن ماں نے اپنی چھوٹی سی تھیلی سے کچھ ریزگاری نکال کر پلنگ پر پھیلا دی اور پھر سکوں کو ایک ایک کرکے گن کر واپس اسی تھیلی میں ڈالتے ہوئے کہنے لگی، "یہ پیسے میرے ہیں، میں نے گھر کے اخراجات سے دکھ سکھ کے وقت کے لئے پائی پائی کرکے بچائے ہیں۔ میں نے چوری نہیں کی ہے، میں چور نہیں ہوں، میں چور نہیں ہوں۔" میں سناٹوں میں گم ہو کر خود کو تلاش کر رہی ہوں۔ کیا کہوں اتناسب دیکھنے کے بعد، سننے کے بعد! اتناسب کچھ ہو جاتا ہے انسان کی زندگی میں کہ اس کو بھولنے کی کوشش میں زندگی ٹکڑوں میں بٹ جاتی ہے۔ کاش! ایسی کوئی مشین ہوتی جو ماضی کی یادوں کو دوبارہ یادوں میں آنے سے روک لیتی، تاکہ حال کے کسی حصے پر اس کی پرچھائیاں پڑ کر اس کو کوئی گرہن نہ لگا پاتیں۔

ایک اتوار، میں نے بڑے پیار سے ماں کا من پسند کھانا بنایا، کچھ نوالے اسے اپنے ہاتھ سے کھلائے اور پھر پلیٹ اسے تھما کر اپنے لئے کھانا نکالنے باورچی خانے گئی۔ جیسے ہی میں نے اپنا ہاتھ کھسکا لیا، وہ مدہوشی کی کیفیت میں نوالہ در نوالہ کھاتی رہی اور آخر میں اٹھتے ہوئے پلیٹ، چمچ لے کر باورچی خانے کی بجائے غسل خانے کی ہودی میں رکھ آئی۔ میں دیکھ کر حیران ہوئی کہ اس حد تک ماں اپنے آپ کو فراموش کر چکی ہے۔ پھر آواز دیتے ہوئے اپنے ہوشمند ہونے کا

اعلان کرتے ہوئے کہا، "منی میں نے کھانا کھالیا ہے اور برتن باورچی خانے میں رکھ دیئے ہے۔ بہت نیند آرہی ہے ۔۔ جا کر سوتی ہوں۔۔۔!" جو اپنا آپ کھو بیٹھا ہو، اسے کیا پتہ کہ کون سی ہو دی کس کام کے لئے ہے۔ یہ یادوں کا کیسا جنگل ہے، جس کی بھول بھلیوں میں ماں، والد صاحب کا پیچھا کرتے کرتے اپنی ذات کو کھو بیٹھی، خود کو فراموش کر بیٹھی، لیکن انہیں ڈھونڈ نہ پائی۔

کبھی وہ والد صاحب کی ایک ٹوپی، جو ان کے پاس اب بھی بچی تھی، سر پر اوڑھ لیتی اور مضبوطی سے اپنے دونوں ہاتھ ں اس پر رکھ لیتی اور کہتی، "نہیں یہ انہوں نے مجھے دی تھی، میں اپنے ساتھ لے جاو□ ل گی۔ یہ تمہاری نہیں ہے، میری اپنی ہے، یہی ایک نشانی رہ گئی ہے!" اپنے اور پرائے کے بیچ کی دیوار اتنی شدید بھی ہو سکتی ہے، سوچ میں، الفاظ میں۔۔۔ اس گتھی کو میں آج تک سلجھا نہیں پائی ہوں۔ میں ان کی اپنی، پرائی کیسے ہو سکتی ہوں؟ اور وہ جو ساتھ چھوڑ گیا، وہ اب بھی اپنا ہے۔۔۔! میں آج اسی بھول بھلیوں میں جی رہی ہوں۔ نکلنے کی کوشش کروں اتنی بھی ہمت نہیں مجھ میں۔ بس اس دور کے ہر ایک لمحے کی گواہ ہو کر میں اپنے آنے والے کل سے آج ہی جڑ رہی ہوں۔ ماں نے اپنی درد بھری کہانی سناتے سناتے میرے اندر سناٹوں کی اتنی خلاؤں کو بھر دیا ہے کہ آج تک میں اس دھند سے باہر نہیں نکل پائی ہوں۔ اس قدر کہ اب اپنا وجود بھی اپنا نہیں لگتا۔ جیسے میں جی رہی ہوں پرچھائیوں کے درمیان، !حصہ رہی ہوں ان یادوں کی پرچھائیوں کے جنگل میں

!عجیب المیہ ہے۔۔۔۔

ماں، والد صاحب کا سہارا بننا چاہتی تھی، بیچ سفر میں ساتھ چھوٹ گیا، کچھ یوں جیسے وجود کا کوئی حصہ کاٹ کر پھینکا گیا ہو۔ بس گھر کا ایک کونا خالی ہو گیا۔ میں ماں کا سہارا بن کر بھی نہ بن پائی، یہ میری بے بسی ہے۔ ماں کا سہارا بنتے بنتے لگ !رہا ہے، ماں، میں بے سہارا ہو گئی ہوں

☆☆☆

ایسا بھی ہوتا ہے

کہاں گئی ہو گی وہ؟ ایسا تو پہلے کبھی نہیں ہوا کہ وہ مقررہ وقت پر گھر نہ لوٹی ہو۔ اگر کبھی کوئی وجہ بن بھی جاتی تو وہ اطلاع ضرور کر دیتی ہے۔ میری فکر کی اسے فکر ہے، بہت ہے۔ لیکن آج اس کی فکر کی تکلیف مجھے یوں گھیرے ہوئے ہے، ں نہ گھر کے اندر ٹک پا رہے ہیں اور نہ گھر کے باہر رکھ پانے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ کہاں ; کہ میرے پاو□ ں، کس سے پوچھوں؟ جب کچھ نہیں سوجھا تو فون کیا، پوچھنے کی پہلی کوشش میں ناکامی ملی، کیونکہ دوسری ; جاو□ جانب کوئی فون ہی نہیں اٹھا رہا تھا، مسلسل گھنٹیاں بجتی رہیں، ایسے جیسے گھر میں بہرے آباد ہوں۔ ہاں، اپنی سمدھن کے گھر کی بات کر رہی ہوں!

اب تو کئی گھنٹے ہو گئے ہیں، رات آٹھ بجے تک لوٹ آتی ہے، اب دس بج رہے ہیں۔ بس اس خاموش سی گھڑی کی طرف دیکھتی ہوں، تکتی ہوں، گھورتی ہوں، لیکن اسے بھی کیا پتہ کہ زندگی احساسات کا نام ہے؟ احساس کیا ہوتا ہے؟ درد کیا ہوتا ہے؟ انتظار کیا ہوتا ہے؟ ان تمام جذبات سے ناواقف۔۔۔!

اور اچانک دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ فون کی گھنٹی ہی بج رہی تھی۔ ہڑبڑاہٹ میں اٹھانے کی کوشش میں بند کرنے والا بٹن دب گیا اور بیچارہ فون پوری آواز سمیٹ کر خود ہی خاموش ہو گیا۔ میں نے اپنا ماتھا پیٹ لیا۔ آواز تو سن لیتی، پوچھ تو لیتی کہاں ہو، ابھی تک کیوں نہیں آسکی ہو؟

میں نے اپنی سوچ کو لگام دی، لمبی سانس لی، پانی کا ایک گلاس پی لیا اور پھر ایک اور بھی۔ پرسکون ہونے کی کوششوں میں پلنگ پر بیٹھ گئی اور فون کو ٹٹول کر دیکھا، کوئی انجان نمبر تھا، اس کا نہیں، جس کا انتظار تھا۔ بغیر سوچے سمجھے میں نے وہی نمبر ملا دیا۔ گھنٹی بجی، بجتی رہی اور پھر بند ہو گئی۔ اب میرا ڈر مجھے سہم جانے میں پر مجبور کر رہا تھا، میرے ہاتھ ل ٹھنڈے ہو رہے تھے، ایک جھرجھری بجلی کی طرح اندر پھیلنے لگی۔ میں نے بٹن پھر دبایا، گھنٹی بجی، کسی نے ز پاو□ اٹھایا اور پھر رکھ دیا۔ اب میری پریشانی کا مزید بڑھ جانا حق بجانب تھا۔ رات کا وقت، بیتابی سے اس کا انتظار اور بات !چیت کا سلسلہ موقوف، جیسے تمام جانب کرفیو لگا ہوا ہو

آخر فون کی گھنٹی بجی، ایک دو تین بار۔۔۔! میں نے بہت احتیاط سے اسے اٹھایا، ابھی کان کے قریب لائی ہی تھی کہ ایک کٹھور آواز کانوں سے ٹکرائی۔ "پریشان مت کرو، آج وہ گھر لوٹنے والی نہیں۔ ابھی ایک گھنٹے میں اس کی شادی ہو رہی ہے، پریشان مت کرنا۔" بے رحمانہ انداز میں کہتے ہوئے اس نے کال منقطع کر دی اور میں بیہوشی کی حالت میں بڑبڑاتی، کپکپاتی، وہیں پلنگ پر اوندھے منہ گر پڑی۔

کون ہے یہ؟ کس کی آواز ہو سکتی ہے؟ کیا چاہتا ہے وہ، کیوں گمراہ کر رہا ہے مجھے، میری سوچ کو اور اس کے ساتھ اس کو بھی، جو میری سانسوں کی دھڑکن ہے؟ وہی تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے، اس کے بغیر میری زندگی سونی ہے، ادھوری اور نامکمل! وہ میرے زندہ ہونے کا سبب ہے اور اسی سبب کے ساتھ بے سبب ہی یہ کیا کچھ ہو رہا ہے، جس کے محض تصور سے ہی میرے بدن میں خوف، زہر بن کر پھیلتا جا رہا ہے۔ ایسا تو ہونا ہی ہے، ضرور ہو گا، وہ میرا خون ہے، میری نسل کی آخری نشانی، جسے میں نے سینے سے لگا کر پالا، بڑا کیا اور اسے چھتر چھایا دیتے دیتے میں خود ایک بوڑھا درخت بن

گئی۔ پرانے، سڑے گلے سب پتے جھڑ گئے اور موسموں کے ہر جھونکے کی آنچ سے بچا کر میں نے جسے اپنے آنچل کی ں دی، وہیں ارملا کے روپ میں ایک نیا شگوفہ اگ آیا۔ بارہ مہینوں سے بائیس سال تک کا عرصہ کوئی کم چھوٹا ٍ چھاو ☐ !تو نہیں ہوتا

....

اچانک دربان خبر لایا تھا، بری، جی، بہت بری خبر۔ میرے ابھے اور سویتا کے خاتمے کی اور ان کی آخری نشانی "ارملا" کو لاکر گود میں ڈال دیا۔ گیارہ ماہ کی ہی تو تھی وہ ریشم کی گڑیا، جس کے نرم لمس سے من میں ٹھنڈک سرائیت کر جاتی، جسکے گال اپنے گالوں سے سہلانے سے خون میں روانی بڑھتی، ایک تازگی رگوں میں بہنے لگتی، اس کی کلکاریاں، سانسوں کو مہکا دیتیں، اور زندگی، زندگی سی لگنے لگتی۔

میری راتیں دنوں میں بدل گئیں۔ کیا سونا، کیا کھانا، کیا ہنسنا، کیا رونا، سب اس کے ساتھ ہی ہوتا رہا۔ ہاں، اُرمی کے ساتھ، وہ دھوپ میں سایہ! وہ اٹھے تو میں اٹھوں، وہ جاگے تو میں جاگوں، وہ سوئے تو میں سوؤں۔۔۔ ایک طرح سے، میں دل و جان سے وقف ہو گئی تھی اس معصوم جان کے لئے اور وہ میرے جینے کا سبب بن گئی تھی۔

ں چھوتے ہوئے ابھے اور ٍ وہ دیوالی کا منحوس دن ہی تو تھا، جو کچھ گھنٹے پہلے اُرمی کو گود میں گھر سے نکلے تھے۔ پاو ☐ سویتا نے کہا تھا، "ماں دو گھنٹے میں لوٹ آئیں گے، آتے ہی دیوالی کی پوجا ساتھ کریں گے۔ مٹھائی لے کر کچھ دوستوں "سے مل آتے ہیں۔

اور جانے والے کبھی نہ لوٹنے کے لئے چلے گئے۔ لوٹ آئی میرے دل کی دھڑکن اُرمی کے روپ میں، شاید اسی کے لئے میں زندہ ہوں۔

ں، ٍ گھنٹی پھر بجی، ماضی سے حال میں آتے ہی میری بے بسی میرے ساتھ چھٹپٹانے لگی۔ اب کیا کروں؟ فون اٹھاو□ ں؟ نہیں اٹھاتی تو کیسے پتہ چلے گا کہ میری جوان بچی کہاں ہے اور کیسی ہے؟ فون اٹھاتے ہی رکھ دیا، جیسے ٍ نہ اٹھاو□ ں کا ڈنک ایک ساتھ لگا ہو۔ ”میں تھوڑی دیر میں اس کے ساتھ آپ سے آشیرواد لینے آ رہا ہوں۔“ ٍ ہزار بچھوو□ !بس اتنا ہی سن پائی

کون ہے یہ، کس کی آواز ہے، جس میں غیرت کے ساتھ ساتھ اپنا پن بھی ہے۔ پر وہ کہاں ہے، جس کی آواز سننے کو میرے کان ترس رہے ہیں؟ جسے دیکھنے کے لئے میری آنکھیں بے چینیوں کے صحرا میں بھٹک رہی ہیں۔

اچانک فون کی گھنٹی پھر بجی، اٹھاتے ہی تہذیب کے دائرے سے باہر آ کر میں ابل پڑی، ”تم کون ہو اور کیوں بار بار پریشان کر رہے ہو؟ میری بات میری پوتی سے کرادو۔“

”ابھی تو وہ گھر میں داخل ہو کر اپنے ساس سسر کی آشیرواد لے رہی ہے۔ میں بس ابھی اس کے ساتھ آپ کے پاس آرہا ہوں، پھر آپ جتنی چاہے اس سے باتیں کر لیں۔“

”پر تم ہو کون؟“

”آپکا جمائی، آپکی پوتی کا شوہر۔“

”شوہر۔۔۔!“ میں حیران و پریشان سی ساکت بنی کھڑی رہی۔ رسیور میرے ہاتھوں سے چھوٹتے چھوٹتے بچا، لیکن لائن کٹ گئی۔ اسی وقت دروازے پر دستک نے مجھے دہلا دیا۔ ڈری ڈری سی، سہمے سہمے کانپتے ہاتھوں سے میں نے کنڈی کھولی۔ سامنے سجی سنوری، مانگ میں سندور سجائے، سرخ ساڑی میں اُرمی کھڑی تھی اور اس کے برابر میں دولہا، اپنا چہرہ سر پر سجے سہرے کی لڑیوں میں چھپانے میں کامیاب رہا۔

میں سکتے میں تھی، دماغ مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا کام کر تا رہا، اب ڈر کے ساتھ غصہ بھی من میں گھس آیا تھا۔ اُرمی بالغ ہوئی تو کیا ہوا، مجھے بتائے بغیر کسی ایرے غیرے کے ساتھ بیاہ کر لیا اور اب آ کر سامنے کھڑی ہو گئی ہے۔

مجھے ابھی تک یہ سب حادثہ ہی لگ رہا تھا، شدید نوعیت کا حادثہ! اُرمی بھی پتھرائی سی کھڑی تھی میرے سامنے۔ اسکی مسکراہٹ، جو اس کا خاصہ تھی، نجانے کہاں غائب ہو گئی ہے۔ کہنا تو نہیں چاہتی، سوچنا بھی نہیں چاہتی کہ ایسے کیوں لگ رہا ہے جیسے کوئی ان چاہی سازش ہے، جس میں اُرمی جکڑی ہوئی ہے، اسی لئے تو اسکی مسکراہٹ پر بھی کرفیو لگا ہوا ہے۔ جتنا میں سلجھے ہوئے خیالوں سے ہر پہلو پر روشنی ڈالتی، اتنی ہی میں الجھنوں کا شکار ہوتی جاتی۔ کبھی جذباتی انداز سے ارم کی طرف دیکھوں، جو اپنے شوہر کے ساتھ ایسے کھڑی ہے، جیسے میں ان کا استقبال کرنے کے لئے کھڑی ہوئی ہوں۔ نہ شور، نہ شرابہ، نہ بینڈ، نہ باجا، بس پھول، پھولوں کی مالا، سرخ دمکتی ساڑی اور لڑکے کی پوشاکوں سے ظاہر ہو تا کہ وہ دونوں نئے شادی شدہ جوڑے ہیں۔ بس اور کچھ نہیں تھا، نہ شہنائی، نہ منڈپ، نہ پھیرے، نہ مہمانوں کی ہلچل، نہ کھانا، نہ پینا، ایسا کچھ بھی نہیں جس سے لگے کہ یہ شادی ہوئی ہے۔ اور میں اس کی دادی انجان سی کھڑی دیکھ رہی، سوچوں میں ڈوبی اس پار کھڑی ہوں اور وہ گھر کی دہلیز کے اُس پار۔

ہمیشہ سہاگن کا آشیرواد دیجیے دادی۔" اچانک سوچ کے سبھی بندھن ٹوٹے۔ میں نے ارم کی جانب دیکھا، جو ملے" جلے جذبات سے میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔ میں نے بغیر مسکرائے، سب کچھ نظر انداز کرتے ہوئے، تقریباً گرجتی آواز میں اس انجان دولہا کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا، "کیا تمہارا چہرہ دیکھنے کے لئے تمہیں منہ دکھائی "دینی پڑے گی؟

میرا حق تو بنتا ہے۔" وہ گڑگڑایا۔"

خاموشی اب بھی ماحول پر غالب رہی۔ پھر دولہا کے جسم میں حرکت ہوئی، وہ آہستہ آہستہ مکمل طور پر جھکا، تاکہ اس کے ہاتھ قدموں تک پہنچ پائیں۔

جانے کیا تھا اس لمس میں کہ میرے ہاتھ خود بہ خود اس کی پیشانی پر چلے گئے اور منہ سے نکلا "ہمیشہ خوش رہو" اور میں بے ساختہ وارفتگی کے عالم میں پھولوں کے نقاب کے پیچھے سے اپنی اُرمی کے دولہا کو دیکھنے سے روک نہ پائی۔ جیسے ہی ں چھو کر سر اٹھانے لگا، میں نے اس کے سہرے سے لٹکتی پھولوں اور موتیوں کی لڑیوں کو ہٹایا تو ایک سلونی ز وہ پاو□ مسکراہٹ سے سامنا ہوا۔ دیکھا سامنے خوبصورت نین نقش، چمکدار آنکھوں، دل نشین مسکراہٹ لئے دونوں ہاتھ جوڑے کھڑا تھا، سوجان۔

میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے دونوں کو گلے لگایا، آرتی ٹیکا کر کے انہیں گھر میں داخل کرایا۔ ابھی دل میں خوف کی، ڈر کی دھند چھٹ گئی تھی۔

واقفیت کی روشنی میں غیریت کا اندھیرا گم ہو گیا۔ دل کے سارے وسوسے رفو چکر ہو گئے۔ دل نشین مسکراہٹ کا مالک سوجان، میری بہو سویتا کا چھوٹا بھائی، آج میری اُرمی کے شوہر کے روپ میں سامنے تھا۔

میں باورچی خانے کی طرف بھاگی، جہاں سے منہ میٹھا کرنے کے لئے اور کچھ نہ پا کر شکر کا ڈبا لے آئی۔ باری باری دونوں کو چٹکی بھر شکر کھلائی اور پانی پلایا۔ گھر میں سادگی سے خوشیاں داخل تو ہوئیں، لیکن دل میں ایک الجھی گتھی مجھے بے قرار کر رہی تھی۔

"دادی آپ بیٹھیں، زیادہ پریشان نہ ہوئیں۔"

!لیکن میں نے ان کی ایک نہ سنی، فون اٹھایا اور لگایا اُرمی کی نانی کو۔۔۔

مبارک ہو دادی جی۔" ادھر سے پہل ہوئی۔"

"آپ کو بھی نانی جی، پر یوں چھپ کر یہ سب۔۔۔؟"

کیوں اور کیسے، آپ سب جاننے کے لئے بیقرار ہیں، ہمیں اس کا احساس ہے۔ آپ کو تو پتہ ہی ہو گا، جب نواسی اپنے" ماما سے شادی کرتی ہے تو چوری چھپے صرف لڑکے کے خاندان میں ہی کی جاتی ہے، اگر آج سویتا ہوتی تو وہ بھی شامل نہیں ہوتی۔ ہم ابھی آپ کے پاس پانچ سات منٹ میں پہنچ رہے ہیں۔" اور فون کٹ گیا۔

ارم کے نانانانی آرہے ہیں، یعنی میرے سمدھی۔ سمدھی تو وہ تھے ہی، اب رشتہ اور مکمل ہوا ہے اور میری ہر فکر کا حل سہولت سے نکلتا گیا۔ اسی وقت دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ باورچی خانے سے باہر نکلتے ہی دیکھا اُرمی نے دروازہ ل چھور ہی تھی۔ فضامیں ہٖ کھولنے میں پہل کی تھی اور اب اپنی نانی، سوجان کی ماں کو ساس کا درجہ دیتے ہوئے پاو□ خوشیاں گھل مل گئیں۔ مبارک باد کا تبادلہ ہوا، منہ میٹھا کیا اور مل کر چائے ناشتے کے ساتھ باتیں ہوتی رہیں۔ کچھ کہی جا رہی تھی، کچھ سنی جارہی تھی، لیکن سب کی سب خوشگوار اور پر مسرت تھیں۔

گفتگو کے دوران کئی انجانی چیزوں سے پردہ اٹھا، جیسے اس رات ارم اور سوجان نے تمام تر مذہبی رسومات کے ساتھ مندر میں اپنے والدین کے سامنے شادی کی اور وہ نانی کو سرپرائز دینا چاہتے تھے۔ حقیقت میں نانی کو یہ پتہ تو تھا کہ آندھرا پردیش میں کچھ خاص ہندو خاندانوں میں یہ رسم موجود تھی کہ بہن کی لڑکی کا بیاہ پراسرار طریقے سے ماموں کے ساتھ کروادیا جاتا اور اس کے بعد ماں اور بیٹی سمدھن بن جاتیں۔ بھائی، بہن کا جمائی بن جاتا اور لڑکی نانی کی بہو۔ دادی آج سویتا کی جگہ کھڑی تمام رشتے قبول کرکے بہو کی یاد میں رو پڑی۔ لیکن اس میں ایک خوشی بھی پوشیدہ تھی کہ !اسے اُرمی کے لئے اس ماموں، شوہر کے روپ میں ایک دردان سوروپ ملا، ایک محافظ، ایک کوچ بن کر

فون پر کہے وہ الفاظ "پریشان مت کرو، ایک گھنٹے میں اس کی شادی ہو رہی ہے" اب ایک خوشگوار یادگار بن گئے۔

دادی ہم سب نے طے کیا کہ یہ شادی پراسرار طریقے سے انجام دے کر ہم آپ کے پاس آشیرواد لینے آئیں۔" ہمیں پتہ ہے کہ آپ اُرمی کو خود سے جدا کرکے ہمارے گھر کی بہو بنانے کے لئے راضی نہیں ہوں گی۔" کہتے ہوئے اُرمی کی نانی نے اٹھ کر دادی کو گلے لگایا اور انکے آنسو پونچھے۔ سبھی کا درد سانجھا تھا، سب کی خوشیاں بھی سانجھی تھیں۔

آنکھوں میں ایک منظر تیر گیا، بارہ مہینے کی ننھی اُرمی اور بائیس سال کی نوجوان اُرمی اپنی نانی کی بہو بنی، اپنی ماں کی خواہش پوری کی اور اب عقیدت مندانہ انداز میں دادی کے چرنوں کی جانب جھکی تو دادی نے اسے اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

کل رات اور آج صبح تک کے بیچ وہ دردناک وقت اب خوشیوں کی پھوار میں بدل گیا تھا۔ آج دادی نے محسوس کیا کہ دو نسلوں کو پاٹنے والا پیار ایسا بھی ہوتا ہے۔

☆☆☆

بے مطلب کے رشتے

"مس رمامیں اپنے بارے میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔"

سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے کرسٹی کھڑی تھی، آنکھوں میں کچھ الجھن کے سائے، آواز میں ایک ناامیدی اور چال میں سستی لئے۔ یہ تبدیلی میں گزشتہ کئی دنوں سے اس کے انداز میں دیکھ رہی تھی۔

کرسٹی میری اسسٹنٹ ٹیچر ہے، دو سال سے میرے ساتھ ہے۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ اس کی دو بڑی لڑکیاں ہیں، جن کی عمریں بالترتیب سترہ اور پندرہ سال ہیں، ایک لڑکا جو بارہ سال کا ہے۔ شوہر سے طلاق سات آٹھ سال پہلے ہوئی ہے۔ کرسٹی پڑھائی بھی کرتی ہے اور نوکری بھی۔ یہ چلن امریکہ میں بہت عام ہے، حکومت بھی اس میں بہت مدد گار رہتی ہے، مالی مدد، کتابوں کا خرچ اور کئی سہولیات اسکی جانب سے ملتی ہیں۔ ہاں شروع میں حیران ہونے کا امکان زیادہ رہتا تھا۔ دماغ پر ان چاہا زور ڈالنے سے کوئی حل سامنے نہیں آتا، بس سب کچھ اپنانا پڑتا ہے۔ آہستہ آہستہ وہاں

رہتے ہوئے، کام کرتے ہوئے سبھی اسی رو کی بہتی دھارا میں بہنے لگتے ہیں۔ بہاؤ کے مخالف تیرنا آسان کہاں؟ وہاں کے حالات اور ماحول کو دیکھتے ہوئے، کچھ زیادہ سوچنا بیکار سا لگتا ہے۔

"بیٹھو کرسٹی اور بتاؤ کیا بات ہے؟" میں نے اپنائیت سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے کہا، "رماشڈ آئی ہیوانادر بے بی؟ میں یہ جاننا چاہتی ہوں آپ کی اس کے بارے میں کیا رائے ہے؟"

اس سوال نے اچانک مجھے چونکا دیا۔ کرسٹی پینتس سال کی جوان عورت، نیویارک میں پلی بڑی، تین بچوں کی ماں، چوتھا بچہ پیدا کرنا چاہتی ہے، یہ سوچے بغیر کہ وہ اخلاقی طور پر صحیح ہے یا نہیں ہے۔ اور میں ہندوستان کی پیدائش، وہاں کی بلندیوں سے واقف، آج یہاں اپنے خاندان کے ساتھ رہ کر بھی اپنی ثقافت کو اپنی وراثت مان کر چلنے والی، اپنے خاندان کے افراد کی جانب سے بھی یہی امید اور آس من میں رکھ کر آگے بڑھتی رہتی ہوں۔ ہمارے سنسکار ہماری بنیاد ہیں، جن کی جڑیں بہت مضبوط ہے، اسی لیے آسانی سے یہاں کی روشن راہیں ہمیں بہت جلد گمراہ نہیں کر پاتیں۔ شاید ہر ہندوستانی کی یہی رائے ہے، کیونکہ ہماری تہذیب، ثقافت گھر سے شروع ہو کر خاندان پر ختم ہوتی ہے۔ ثقافت طرزِ عمل کی مانگ کرتی ہے اور اس طرح کے ایک سوال نے میرے سامنے ایک نہیں کئی دیگر سوال کھڑے کر دیئے۔ بجلی کی رفتار سے کچھ سوالات، کچھ جواب خیالوں میں امنڈنے لگے۔

"اس بچے کا باپ کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرا بوائے فرینڈ!" بہت آسانی سے اس نے کہا اور یہ بھی بتایا کہ گزشتہ تین سالوں سے ان کے باہمی تعلقات ہیں۔

"یہ اس کی مرضی ہے یا تمہاری؟" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"میری!" یہ کہہ کر وہ میرے جواب کا شاید انتظار کرنے لگی۔

بچہ ہونے پر کیا وہ ایک باپ ہونے کی ذمے داری لے گا؟ کیا وہ تم سے بچہ پیدا ہونے سے پہلے شادی کرے گا؟" "
میں نے ایک ساتھ کئی سارے سوال پوچھ لیے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں سوچوں کے سمندر میں اپنی الجھن کے ساتھ بہتی جارہی تھی۔ زندگی میں کبھی اس طرح کے حالات کا سامنا ہوا نہ تھا۔ اور سوچ کا سلسلہ ٹوٹا کرسٹی کی آواز سے جو میری طرف مخاطب ہو کر کہہ تھی،

رما شادی کرنا کوئی زیادہ اہم نہیں ہے اور نہ ہی میں یہ امید رکھتی ہوں کہ وہ میرے اس بچے کا باپ بنتا پھرے یا "
میرے شوہر ہونے کا دعوی کرے۔ میں آزاد ہوں، آزاد رہنا چاہتی ہوں، کوئی نئی پابندی مجھے جکڑے یہ مجھے منظور نہیں۔ جہاں میں تین بچوں کو پال سکتی ہوں، وہیں ایک اور کو بھی سنبھال لوں گی۔ میں آپ سے صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ کیا یہ میرے لئے ٹھیک ہو گا؟ اور آپ کی اپنی رائے کیا ہے اس بارے میں، کیونکہ ہندوستان کی روایات کے بارے میں، میں بہت کچھ سن چکی ہوں، آپ کے ساتھ کام کرتے ہوئے دیکھتی ہوں اور محسوس کرتی ہوں کہ آپ سنگل ہوتے ہوئے بھی خاندان کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔ آپ کے بچے آپ کے ساتھ ہیں، آپ ان کے ساتھ۔ اسی "وجہ سے مجھے لگا کہ میں یہ جان لوں کہ آپ کی سوچ اس بارے میں کیا ہے؟

کرسٹی یہ موضوع بہت نازک ہے اور اس کا تعلق جڑتا ہے براہ راست ماں سے، چاہے وہ ہندوستان کی ہو یا امریکہ کی "
ہو۔ اگر بچہ ہو گا تو وہ تمہارے جسم کا حصہ ہی ہو گا اور تعلق بھی تمہارے ساتھ گہرا ہو گا، کیونکہ تم ماں ہو، اور ہمیشہ رہو گی۔ لیکن کیا تمہارے تینوں بچے اس نئے بچے کو قبول کر سکیں گے؟ ایسی کئی چھوٹی بڑی باتیں آگے چل کر سامنے آئیں گی، جو تمہیں کسی دشواری میں نہ ڈال دیں۔ ان باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے تم جو بھی چاہو فیصلہ کرو گی، وہ تمہارا اپنا ہو گا۔ ایک قدم آگے بڑھانے کے لئے تم تین قدم پیچھے نہیں چاہو گی۔ دوسری بات، اگر زندگی میں کہیں آگے چل کر تمہارے کسی بچے نے یہی قدم اٹھایا تو ماں ہو کر بھی تم انہیں کوئی ٹھوس مشورہ یا عمدہ نصیحت نہیں دے سکو گی، شاید تمہاری کوئی بھی بات انہیں قابل قبول ہی نہ لگے۔ اس وقت اپنے وجود کو دھتکارے جانے پر تمہیں براضرور لگے

گا۔ ایک نئے رشتے کی کڑی کو جوڑنے کے لئے تم بہت سے پرانے رشتوں کی کڑیوں کو کمزور کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ فیصلہ تمہیں ہی کرنا ہے کیونکہ زندگی تمہاری ہے، مگر تمہاری زندگی سے منسلک تمہارے تین بچے بھی تمہاری ذمے داری ہیں، یہ مت بھولنا؟" میں نے جذبات کے بہاؤ کے زیرِ اثر نجانے کیا کیا کہہ تو دیا، لیکن جب اس کے اثرات دیکھنے کے لئے کرسٹی کی طرف دیکھا تو پایا کہ وہ سنجیدگی سے میری ہر بات سن رہی تھی۔

"کرسٹی تم بہت ہی سوچ سمجھ کر، اپنے دل کی عدالت کا فیصلہ سننے کے بعد فیصلہ کرو۔ تم جو بھی فیصلہ کروگی اس کے اچھے اور برے نتائج کے دور سے تمہیں اکیلے ہی گزرنا ہو گا۔ جو اس بچے کا باپ ہے، تم اسے بھی اس ذمے داری سے آزاد کر رہی ہو۔ اس لئے جو بھی کرو ٹھنڈے دماغ سے سوچ سمجھ کر کرو۔ کبھی کبھی رشتے بنانے میں ہم جتنی جلد بازی کر بیٹھتے ہیں کہ بعد میں وقت آنے پر خود بھی انہیں نبھا نہیں پاتے۔ اگر ان کی اہمیت ہمارے مفاد کو پورا کرتی ہے تو پھر ایسے رشتے صرف رسموں کی طرح بن جاتے ہیں، جہاں جذبات کوئی اہمیت نہیں رکھتے ہیں اور جذبات کے بغیر کے رشتوں کی کوئی بنیاد ہی نہیں ہوتی۔ اب تم اپنے آپ سے پوچھو اور ہر اس سوال کا جواب اپنے دل کی گہرائیوں کو ٹٹول کر پالو۔"

ایسا کہہ کر میں چپ ہو گئی، لیکن میرے من کی مینا کچھ اور کہے جا رہی تھی جو میں اچھی طرح سن پا رہی تھی۔ شاید ہماری سوچ اپنی تہذیب اور ثقافت سے جڑی ہوئی ہے، اسی لئے ہماری جذبات بھی اپنے خاندان اور ماحول کے ساتھ کچھ مضبوطی کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے، "آزاد ملک کے آزاد لوگوں کو ہر طرح کی آزادی ہے، لیکن آزادی کا صحیح استعمال کرنا پابندی کے دائرے میں ہوتا ہے۔ زنجیروں کی گرفت سے آزاد ہو کر ہم پھر بھی کتنے غلام رہتے ہیں، اپنی خواہشوں کے، اپنے من کی امیدوں کے اور اسی آزادی کی قیمت بھی ہمیں اتنی ہی بڑی ادا کرنی پڑتی ہے۔ آزادی کا متضاد ہے پابندی اور غلامی

کے فریم میں رہ کر جو آزادی ہم استعمال کرتے ہیں، چاہے وہ جسم کے ساتھ منسلک ہو یا دل سے، وہ ہمارے وجود کو اچھے برے تجربوں سے سجا کر پختگی بخشتی ہے۔

کرسٹی مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ کہنے لگی۔ "مس رما، میں آپ کی بات پر غور ضرور کروں گی، لیکن یہ طے ہے کہ اس بچے کے باپ کو شوہر کا درجہ نہ دے پاؤں گی۔ میں اپنی زندگی میں نہ کوئی پابندی چاہتی ہوں، نہ کسی کا دخل۔ میں اپنی محنت کے بل بوتے پر اس بچے کی پرورش کر سکتی ہوں۔ اور حکومت کی طرف سے بھی مجھے گھر کے کرائے اور خرچ کے لئے مالی مدد مل جاتی ہے، کیونکہ میں انکی اکیلی کمانے والے ماں ہوں۔ ہاں، آپ کی باتیں سننے کے بعد اپنے تینوں بچوں کی بابت ضرور سوچوں گی، اس رشتے کو مزید مضبوط کرنے کی کوشش کروں گی۔ بچوں سے اس بارے میں بات کروں گی اور ان کے دل کی بات جاننے کی کوشش کروں گی۔ شاید ہم سب مل جل کر گھر کو بکھرنے سے بچانے کی کوشش کر پائیں۔ میں آپ شکر گزار ہوں، جو مجھے اس بات سے روشناس کرایا۔" وہ کہہ کر چلی گئی اور میں سوچ کے سمندر میں غوطے لگاتی رہی۔

کرسٹی نے رما کو اپنا دوست مان کر اس سے مشورہ مانگا اور رما نے بھی اسے صحیح مشورہ دیا۔ اب فیصلہ اسے لینا ہے۔ تقدیر تقدیر کہہ کر کوئی بھی

ذمے داری سے آزاد نہیں ہو سکتا، تقدیر تو پانی کی ایک لہر ہے جو بہتی رہتی ہے، جسے کوئی روک نہیں پایا ہے۔ لیکن تدبیر سے آپ کی زندگی کو سنوار کر نکھارا جا سکتا ہے۔ آپکی تقدیر کو ایک نئی سمت دی جا سکتی ہے، ٹھیک اسی طرح جیسے کوئی کاریگر اپنے ہنر سے چٹان کا سینہ چیر کر پتھر میں جان پھونک دیتا ہے۔ جو صحیح وقت پر برائیوں سے آگاہ کرائے، وہ سچا دوست ہی ہو سکتا ہے، مگر ان میں سب سے اہم بات ہے صحیح رشتوں کی پہچان۔ یہ رشتے نت نئے روپ دھارتے ہوئے اپنی خصوصیات کی سیڑھیاں پر قدم رکھتے ہوئے آگے نکل جاتے ہیں، کبھی بنا غرض سے، تو کبھی خود غرضی سے، کبھی نفرت تو کبھی محبت کے رکھ رکھاؤ سے۔ ہر دور سے گزرنے کے بعد ہی تجربوں کی عینک پہن کر کچھ صاف

دیکھ سکتے ہیں۔ تجربہ کوئی مفت میں ملنے والی چیز تو ہے نہیں، اس کے لیے وقت اور عمر لگانی پڑتی ہے۔ رشتوں کی پہچان بھی رشتوں کے درمیان رہ کر ہوتی ہے۔ ہر رشتے سے جوجھتے جوجھتے ان زنجیروں سے آزاد ہونا پڑتا ہے اور پھر ایک نیا رشتہ جوڑنا پڑتا ہے خود سے، جس کی بنیاد ہر مطلب سے پرے ہوتی ہے۔ یہی بے مطلب کا رشتہ ہر مفاد سے آگے، ہدایت بن کے راہ روشن کرتے ہوئے ہمیں ہماری حقیقی منزل کی طرف لے جاتا ہے۔

☆☆☆

شیلا

ہاں وہ شیلا ہی تھی۔ میں اسے پہچاننے کی بھول کیسے کر سکتی تھی، جسے برسوں دیکھا ہو، ساتھ وقت گزارا ہو، پل پل اس کے بارے میں سوچا ہو۔ وہ بھی کوئی بھلائی جانے والی چیز ہو سکتی ہے۔

شیلا تھی ہی ایسی، جیسے کسی کاریگر کی تراشی ہوئی ایک زندہ مورتی، جو تن کا لباس اوڑھ کر اس سنسار کی سیر کو نکلی ہو۔ جس راہ سے وہ گزرتی، گذرنے والے تھم جاتے تھے، جم سے جاتے تھے۔ ان کی آنکھیں پتھرا سی جاتیں، جیسے کسی نور کو سامنے پایا ہو۔ ہاں وہی حور پری سی شیلا، میری عزیز سہیلی، آج میرے سامنے سے گزر رہی ہے، خود سے ہو کر بے خبر۔

بارہ سال کوئی اتنا طویل عرصہ تو نہیں ہوتا کہ انسان اس قدر بدل جائے کہ نہ صرف رنگ وروپ، بلکہ نشست و برخاست اور چال ڈھال میں بھی، جیسے پورے وجود کی ہی کایاپلٹ گئی ہو۔ وہ کالج کا زمانہ بھی خوب ہوا کرتا تھا، جب میں اور شیلا ساتھ ساتھ رہا کرتے تھے۔ ایک کمرے میں، ایک ہی کلاس میں اور لگ بھگ پورا وقت ساتھ گذارتے،

ساتھ کھانا، ساتھ پڑھنا، ساتھ وقت سونا، سب کچھ ساتھ ساتھ۔ کیا اوڑھنا ہے، کیا بچھانا ہے، ایسی ہر سوچ سے آزاد، آزاد پنچھیوں کی طرح چہچہاتے ہوئے، ہر لمحے کا لطف اٹھاتے ہوئے، ہر سال کالج میں ٹاپ کرتے ہوئے، اب ہم دونوں فائنل ایئر میں جا پہنچے۔ چار سال کا عرصہ کچھ کم تو نہیں ہوتا، کسی کو جاننے کے لئے، پہچاننے کے لئے۔

ارے شیلا۔" میں نے قریب کر اسے پکارا۔ کھوئی کھوئی سی اجنبی آنکھیں، بغیر کسی جذبے کے میری جانب اٹھیں،" اٹھ کر پھر جھکیں اور وہ قدم آگے بڑھا کر چل پڑی، ایسے جیسے میں کوئی اجنبی تھی۔

شیلا، میں تمہاری سہیلی سوی، سویتا، کیسی ہو؟" اس نے جیسے میری آواز سنی ہی نہ ہو یا چاہ کر بھی سنا ان سنا کر رہی ہو۔" کچھ ایسا احساس دل میں جاگ اٹھا۔ اس تبدیلی کے پیچھے کیا وجہ ہو سکتی ہے، اس نے یہ کیسی خاموشی اوڑھ لی ہے کہ میری بات اس کے کانوں میں نہیں رینگتی۔

اٹھلاتی، بل کھاتی، ہر قدم پر تھرکتی ہوئی شیلا، جیسے کسی کاریگر کی تراشی کوئی مورت، دن بھر گنگناتی اپنے آس پاس ایک خوشبو پھیلاتی، آج اتنی بے رنگ، روکھی، اداس، بنا احساس والی کیسے ہو گئی؟ اگر ہوئی ہے تو کیوں؟ میری بے چینی بڑھی، میں نے آگے بڑھ کر اس کے ساتھ قدم ملا کر چلتے ہوئے آہستہ سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"شیلا، میں تو وہی سوی، سوِیتا ہوں، مگر تم شیلا ہو کر بھی شیلا نہیں رہیں، یہ میں نہیں مانتی۔ تم کیسی ہو؟ سمیر کیسا ہے؟"

میں نے ایک ساتھ کئی سوالات اس کے سامنے رکھ دیئے، ہر سوال پر اس کے چہرے کا رنگ بدلتا، اور جو بدلاؤ اس کے انداز میں آیا وہ چہرے کے آئینے سے صاف عیاں تھا۔ اپنے اندر موجود سچائی کو وہ چاہ کر بھی نہیں چھپا پائی۔ چہرے پر کرب کے بادل مزید گہرے ہو گئے، آنکھوں میں اداسی کے سائے زیادہ گھنے اور بدن سمٹ کر چھوئی موئی سا ہو گیا، جیسے وہ سمٹ کر اپنا وجود چھپا لینا چاہتی ہو۔ میں نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ جب اس نے چھڑانے کی کوشش کی تو

میں نے اور زیادہ طاقت دکھائی۔ پھر اس نے بھی چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ شاید اپنائیت کی گرمی سے پتھر پگھلنے لگا تھا۔

اسی محبت کی آنچ میں پگھل کر ہی تو وہ سمیر کے ساتھ چلی گئی، دور بہت دور اپنی ایک نئی دنیا بسانے اور پیچھے چھوڑ گئی مجھے۔۔ اپنی پیاری سہیلی سویتا کو، آخری سال کی اپنی پڑھائی کو، اپنے آنے والے روشن مستقبل کو! سب کچھ بکھر کر رہ گیا۔ شاید اس سے محبت کی پناہ نے، اس سے وہ روشنی چھین لی تھی، جس میں وہ اپنا روشن مستقبل، اپنے آنے والے کل کی خواہشات کو نہیں دیکھ پا رہی تھی۔ وہ جو کہتے ہیں نہ کہ "پیار اندھا ہوتا ہے"، پیار ہو نہ ہو، پر پیار کرنے والا ضرور اندھا ہو جاتا ہے۔ پیار کے خمار بھری آنکھ سے وہ دیکھ رہی تھی صرف سمیر کو، اسکی پینٹنگز کو اور اس کی تھرکتی انگلیوں کو، جو رنگوں میں ہر وقت لتھڑی رہتی تھیں۔ انہی رنگ میں لتھڑی انگلیوں سے سمیر اپنے قرب وجوار کے پھیکے مناظر میں رنگ بھرتا، انہیں زندہ کرتا۔ نہ جانے کیسا خمار تھا وہ؟ ایک انجان محبت کا جنون ہی رہا ہوگا، جو شیلا نے اپنا مستقبل سمیر کے نام لکھ دیا۔ ایک دن اچانک وہ سمیر کے ساتھ شادی کر کے میرے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

"سوی، مجھے اور سمیر کو شادی کی مبارک باد نہیں دوگی؟"

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔ مبا۔۔۔ مبارک ہو! شادی۔۔۔ پر اچانک۔۔۔!" میرے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے

"ہاں، اچانک ہی فیصلہ کرنا پڑا۔ کل سمیر اپنے گھر شملہ واپس جا رہا ہے اور میں بھی اس کے ساتھ جا رہی ہوں۔" کہتے ہوئے شیلا میرے گلے لگ گئی۔

"لیکن دو مہینے کے بعد تیرا فائنل امتحان۔۔۔" میں کہنا چاہ رہی تھی پر کہہ نہیں پائی۔ شاید شیلا جان کر بھی انجان بن رہی تھی یا وہ اب کسی قسم کی دخل اندازی نہیں چاہتی تھی۔ اسی لیے تو شادی کا اہم فیصلہ اس نے اکیلے ہی لے لیا۔ کسی کی رائے کی، یا کسی کی حاضری کی اسے ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ البتہ ایک بات صاف تھی، اس محبت میں اس پر

سمیر کے فن کے ہفت رنگی، رنگوں کا جو خمار چڑھا تھا، وہ اسی رو میں بہے جا رہی تھی۔ کوئی بند وہاں باندھنا بیکار تھا۔ میں بھی یہی سوچ کر اپنے پورے ہوش حواس میں ادھورے، لڑکھڑاتے الفاظ کا سہارا لینے لگی۔

"سوی، اس معاملے میں تم زیادہ مت سوچو، میں نے سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ لیا ہے۔ میں سمیر کے بغیر نہیں رہ سکتی اور نہ وہ میرے بغیر، اس لئے ہم دونوں نے یہ قدم مل جل کر اٹھایا ہے۔ اب میں زندگی کے رنگوں کو اوڑھنا چاہتی ہوں، ان میں اپنی امیدوں کو رنگنا چاہتی ہوں، اس سے زیادہ نہ میں کچھ کہنا چاہتی ہوں، نہ سننا۔۔۔! اب چلو کہیں بیٹھ کر ہم آخری بار ساتھ کھانا کھائیں۔ کل صبح ویسے بھی شملہ کے لئے گاڑی پکڑنی ہے۔ آؤ چلیں!" کہتے ہوئے اس نے میری کلائی ٹھیک اسی طرح پکڑی تھی، جیسے آج میں نے اس کی پکڑی ہے۔

باتوں کے دوران کھانا کھاتے ہوئے میں سمیر کی طرف چوری چھپے دیکھتی رہی، جیسے اس کے اندر کی تہوں کو ٹٹول کر، اسے جاننے کی، پہچاننے کی کوشش کرتی رہی۔ ایسا کیا ہے اس میں جو وہ میری سہیلی کی زندگی میں طوفان بن کر آیا اور سیلاب کی طرح بہا کر لے جا رہا ہے؟ ہمارے ہی کالج میں آرٹ کا استاد، ایک ماہر پینٹر کی حیثیت سے اسے فقط دو مہینوں کے لئے ایک آرٹ کا پروجیکٹ سونپا گیا تھا۔ شاگردوں کو اپنے ہنر سے واقف کروانے، ان رنگوں کے میدان میں کچھ نئی تکنیک کا علم فراہم کرنے کے لئے اسے رکھا گیا تھا۔ لیکن یہ کیا؟ اس نے تو اپنا وقت پورا ہونے سے پہلے ہی شیلا کی زندگی کو اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ رنگوں کی وسعت کا اس سے بہترین تعارف اور کیا ہو سکتا ہے؟ اور اب میری جان، میری سکھی شیلا کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہے، ٹھیک ایسے ہی جیسے کوئی زبردستی روح کو تن سے جدا کر کے لے جا رہا ہو!

میں نے سوچوں کے دائرے سے خود کو باہر نکالتے ہوئے سمیر کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھیں نیچے کیے بے خبری کی حالت میں بیٹھا رہا، جیسے کسی سے کچھ لینا دینا ہی نہ ہو۔ میں اس نئے مسئلے کے حل کے راستے تلاش کرنے لگی، تاکہ شیلا

کو اس کے آنے والے کل کی روشن راہیں دکھائی دیں۔ لیکن وہ تو اسی شاخ کو کاٹنے پر تلی ہوئی تھی، جس پر اس کا مستقبل ٹکا ہوا تھا۔ میں بند دروازوں کو دستک دینے کی کوشش میں سمیر سے مخاطب ہوئی۔

سمیر برا مت ماننا، مگر ایک بات ضرور کہوں گی۔ کیا تم شیلا کی خاطر دو مہینے مزید نہیں رک سکتے، تا کہ شیلا اپنی تعلیم کی " ذمے داری پوری کر لے؟ زندگی بھر ساتھ نبھانے کے لیے ضروری نہیں کہ ہم زندگی کے ساتھ کھلواڑ کریں۔ پڑھائی تو زندگی کو روشن کرتی ہے، اسے یوں آدھی ادھوری۔۔۔؟"میرے لفظ لڑ کھڑا کر آدھے ادھورے رہ گئے۔

سویتا جی یہ فیصلہ شیلا کا ہے، میرا نہیں۔ اس فیصلے سے میں زیادہ خوش تو نہیں، مگر زندگی سے بہت خوش ہوں۔ شیلا " میری آرٹ کی بنیاد بن کر، میری محبوبہ بن کر، میری کامیابی میں میری ہمسفر بن کر ساتھ ساتھ چلے، یہ میری خوش قسمتی ہے۔"

لیکن۔۔۔!" میں ایک لفظ آگے نہیں کہہ پائی، ادھوری کوشش کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ شیلا کی خاموش آنکھوں کے ایک " اشارے نے مجھے کچھ نہ کہنے کا سگنل دے کر خاموش کرا دیا۔

بس وہ چلی گئی، اپنے سپنوں کے راجکمار کے ساتھ، سپنوں کی سنہری دنیا میں، جہاں زندگی کے قوس و قزح شاید رنگوں سے بنائے جاتے ہیں۔ تخیل اور حقیقت کے درمیان فاصلے شاید رنگوں سے بھر جاتے ہیں۔ ویسے وہ گئی، کچھ اس طرح جیسے بے موسم کی آندھی نے اسے اکھاڑ پھینکا ہو۔ اور پھر سب کچھ دھندلا دھندلا سا ہو تا گیا۔ دن گزرے، مہینے گزرے اور پھر سال بھی گزرتے چلے گئے۔۔۔ ایک نہیں، دو نہیں، پورے گیارہ سال۔ اس دوران ایسا ایک دن بھی نہیں آیا، جب میں نے رات کو سونے سے پہلے اسے یاد نہ کیا ہو۔

اس کے جانے کے باوجود میرا دل اچاٹ سا ہو گیا، اداسی اور اکیلے پن نے من میں ڈیرہ جما لیا۔ باوجود اسکے میں نے حالات سے جدوجہد کرتے ہوئے کسی طرح امتحان دیا اور ختم ہونے کے فوراً بعد اپنے گھر چلی گئی۔ دو مہینوں کے بعد

اخبار میں اپنے پاس ہونے کی خبر سے مجھے اتنی خوشی نہیں ہوئی، جتنا شیلا کے امتحان نہ دینے کا دکھ ہوا۔ دل مسوس کر میں نے نوکری کے لئے درخواستیں بھیجیں اور چند ہفتوں میں مجھے ہوٹل میں ریسپشنسٹ کی نوکری مل گئی۔ نوکری میری من پسند نہ تھی، لیکن دل کی اداسی کو دور کرنے کے لئے میں نے قبول لی، تاکہ لوگوں کے درمیان میری اداسی کچھ کم ہو جائے، دل پر ناپسندیدہ عکس کچھ دھندلے ہو جائیں اور میں اپنی زندگی کی راہوں پر آگے قدم رکھ ں۔ ۂ پاو□

سوچوں کا سلسلہ ساتھ تھا، پکڑ میں اس کی کلائی اور ہمقدم ہماری چال۔ آخر میں اسے گھسیٹ کر ایک درخت کے نیچے لے آئی، بٹھایا اور میں بھی اس کے ساتھ چپک کر بیٹھ گئی، جیسے ہم اکثر بیٹھا کرتے تھے۔ تب ہماری آنکھیں ایک دوسرے سے لپٹ جاتی تھیں، مگر آج لگا جیسے وہ ملنے سے کترا رہی تھیں۔

شیلا، شملہ سے اتنی دور، تم یہاں اس شہر میں کیسے آئی؟ کیوں آئی ہو؟ اور سمیر کہاں ہے؟ ساتھ میں ۂ اب بتاو□ " کیوں نہیں آیا ہے؟" میں نے نادانستگی میں کئی سوال ایک ساتھ پوچھ لیے اور جواب کے انتظار میں اس کی طرف دیکھتی رہی۔

خاموشی نے اس کے ہونٹوں کو جیسے سی لیا ہو۔ کہاں گئی اس کی وہ چلبلاہٹ، وہ شوخی، جب سب کچھ بھلا کر وہ سمیر کے ساتھ شادی کر کے اسکے سامنے مبارکباد بٹورنے آئی تھی؟ کہاں گئی وہ شدت جو مستیوں کی بلندیاں چھوتی تھیں؟

جن وادیوں میں نہیں رہنا، ان سے گزرنا کیسا شیلا؟" میں نے اسے کریدنے کی کوشش کی۔ "

جواب میں اسکی ملگجی آنکھوں کے صدف سے کچھ موتی ٹپکے، جنہیں چاہ کر بھی میں اپنے آنچل میں سمیٹ نہ پائی اور نہ ں کے سیلاب میں جانے وہ کتنی گہری ڈوبی، کتنی ابھری، یہ ۂی شیلا نے انہیں روکنے کی کوئی کوشش کی۔ ان آنسوو□

صرف وہ ہی جانتی تھی۔ خاموشی کی فصیلیں توڑتے ہوئے اس نے اٹھتے ہوئے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں ٹھیک اسی طرح "پکڑ لیا، جیسا کہ میں نے اس کا پکڑا تھا، اور کہا، " چلو سوی، کہیں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔

ں کا سمندر پیا، پھر بھی اس کی زبان الفاظ ز چائے کے اس دوران اس نے چائے کے ساتھ نہ جانے کتنے آنسو و□ میں تھاہ پاتی رہی۔ شیلا نے اپنی زندگی کی کہانی کو الفاظ میں سمےٹتے ہوئے مجھے بتایا، "سوی، میں تو اس کے لیے بس " پینٹ برش پر بکھرے ہوئے رنگوں کا ایک نقطہ بھر تھی۔

تھی۔۔۔ مطلب۔۔۔؟" میں نے اپنی الجھن سامنے رکھی۔ "

ہاں تھی۔ اب نہیں ہوں!" اپنائیت کی آنچ سے تھما ہوا درد پگھل کر آنکھوں سے بہہ نکلا اور اسی بہاؤ میں بہتے " ہوئے شیلا کہتی رہی، "سچ مانو سوی، جس طرح سمیر پینٹ برش پر رنگ بکھیر کر میری تصویروں کو سجاتا، اپنے ہنر کی نزاکت سے میری تصویروں کو زندہ کرتا، جنہیں دیکھتے ہی حسن کے دیوانے اسکی فنکاری پر فدا ہو کر پینٹنگ خریدنے لگے۔ منہ مانگے داموں پر آرٹ کے نام پر میری تصویریں بیچی جا رہی تھیں۔ ایک فروخت ہو جاتی تو دوسری بنانے کی دھن اس کے سر پر سوار ہو جاتی۔ نہ وہ دن دیکھتا، نہ رات، بس ایک ہی دھن۔ میرے جسم کے ہر ایک عضو کو رنگوں سے نکھار کر اپنے برش سے ایسے سجاتا، سنوارتا جیسے وہ اسے امر بنا دینا چاہتا ہو۔ دولت کا نشہ، دن سے زیادہ سمیر کی راتیں رنگین کرنے لگا۔ میں دن میں کسی پتھر کی مورتی کی طرح اس کی محبوبہ بن کر گھنٹوں اس کے سامنے بیٹھتی، اور وہ نپے تلے انداز میں میرے ہر زاویئے میں وہ شفاف رنگ بھرتا۔ پینٹنگ بکتی رہیں اور وہ دولت کی کھنک میں کہیں کھوتا چلا گیا۔ آمدنی کا بہاؤ اتنا تیز ہوا کہ اس سیلاب میں وہ مجھے ایک بے کار رنگ برنگی پینٹنگ سمجھ کر خود غرضی کی قربان گاہ پر چڑھانے کے نئے راستے تلاش کرتا رہا۔ سوی، سچ کہتی ہوں، وہیں خود غرضی کی چوکھٹ پر میری موت ہوئی، ایک بار نہیں کئی بار۔ میں پل پل جلی، پل پل مری اور وقت کے ساتھ ساتھ میں بھی پتھرانے لگی۔ میں تمہاری وہ سہیلی تو نہیں رہی، جو اپنا ہر پل تم سے بانٹ لیا کرتی تھی، مگر ہاں، اب بکھری ہوئی وہ شیلا ضرور بن گئی ہوں، جس کا

ذرہ ذرہ وقت کی بیدردمار سے ٹوٹ کر عیب دار ہوتا چلا گیا ہے۔ وہ شیلا جو اپنی آن بان کے ساتھ جی لیا کرتی تھی۔۔۔وہ اب کھنڈر۔۔۔!" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ں نے سب کچھ کہہ دیا۔ مجھے لگا جیسے شیلا بکھر کر ٹوٹ چکی ہے اور ہٰ ان کہے الفاظ نے خالی جگہوں کو بھر دیا، آنسو و □ !مجھ سے وہی پرانی پناہ مانگ رہی ہے۔ ایک قریبی دوست کے آنچل کی گرمی، دوستی کی چھایا، وہی بے لوث رابطہ

میں نے اسے گلے سے لگاتے ہوئے اپنے ساتھ اس طرح لپٹا کر لیا جیسے وہ کبھی مجھ سے جدا ہی نہ ہوئی تھی۔ اس کا بھی مجھ سے لپٹ کر گلے ملنا، روتے روتے ہنسنا، ہنستے ہنستے رونا، کسی حد تک بکھراؤ میں سمٹاؤ لانے کا سبب بنتا گیا۔

جسموں کا رابطہ، دوستی کے سائے میں کام کرنے لگا۔ پناہ پاتے ہی وقت کے مرہم سے آہستہ آہستہ وہ بہتر، مزید بہتر ہونے لگی۔ سورج ڈھلان کی جانب اپنا سفر اختیار کر چکا تھا، بکھرے رنگ دوبارہ سمٹ کر اس بے رنگ شیلا جیسے نقطے میں سماتے چلے گئے۔ مجھے میری عزیز سہیلی مل گئی۔ بوند، سمندر میں سما گئی، آسمان کے بادل چھٹ گئے، مسرت نظروں میں بھر گئی۔

افق کے اس پار ستاروں بھرا آسمان صاف دکھائی دے رہا تھا۔ کب دوپہر سے شام، شام سے رات ہوئی، پتہ ہی نہیں پڑا۔

☆☆☆

جینے کا فن

ں میں پازیب پہنے چھم چھم کرتی، ہرنی جیسی چالوں سے تھرکتی، وہ موسیقی کی ہر ایک تال پر ربط وضبط رکھتے ہ پاو □ ہوئے، ہاتھوں، پیروں اور آنکھوں کے معشوقانہ ناز وانداز سے رقص کرتی رہی۔ رقص ختم ہوتے ہی دیر تک ہال میں تالیوں کی گونج سنائی دیتی رہی۔ ان تالیوں کی آواز کے دوران ایک آواز اور سنائی دے رہی تھی، مسلسل گونجتی ایک مدھر آواز، ایک سُر تال میں، وہ تھی "ونس مور، ونس مور" اور پھر یہ آواز سنائی دیتے دیتے اچانک رک گئی، جیسے پوری رفتار سے چلتی ہوئی کسی گاڑی کو اچانک بریک لگ گیا ہو۔

رقص ختم ہونے پر اسٹیج کا پردہ، جو نیچے گر گیا تھا، ایک بار پھر اٹھا اور ناظرین کی نگاہیں اسٹیج پر جا کر تھم گئیں۔ ہزاروں دلوں کی دھڑکن، انکی پسندیدہ فنکارہ، رقص کی دنیا کی مُیوری پورنما ان کے سامنے کھڑی تھی۔ لیکن یہ کیا؟ اس کا رنگ کیوں اڑا ہوا ہے، چہرے پر پسینے کے قطرے، آنکھوں میں بجھتی ہوئی روشنی کی لو کیوں ہے؟ ہونٹوں کی لالی کی جگہ

گہرے سائے اور رخساروں کی رنگت ایسے اڑی ہوئی، جیسے کسی نے ان پر سفیدی پوت دی ہو۔ دوسا تھی فنکاروں کا سہارالے کر کھڑی تھی، شاید کھڑی بھی نہیں، بلکہ یوں کہیں کہ جیسے ان دو بیسا کھیوں کے سہارے پر پورنما لڑکھڑانے سے بچی ہوئی تھی، جو چند لمحات پہلے تک کسی ہرنی کی طرح تھرک رہی تھی، بجلی کی رفتار سے بل کھار ہی تھی، وہ اس وقت سہارے کی محتاج کیوں؟ چہرے پر کھلتے ہوئے سمن کی لالی کی جگہ سفیدی کیوں چھائی ہوئی تھی؟ مرجھائی ہوئی مسکراہٹ کیوں؟ تمام ہی ناظرین کے ذہنوں میں سوالوں کا انبار اٹھا، جس کا جواب سب جاننا چاہتے تھے۔ لیکن ہر کوئی خاموش بیٹھا تھا، سب کے لب سلے ہوئے تھے، جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ "ونس مور، ونس مور" بولنے والی زبانوں پر جیسے تالے لگ گئے تھے۔۔۔اور۔۔۔خاموشی کے اس سرد سناٹے کو ایک جانی پہچانی لرزش بھری آواز نے توڑا۔ یہ آواز کسی اور کی نہیں، ناظرین کی چہیتی پورنما کی ماں نرملا دیوی کی تھی، جو بیٹی کا سہارا بن کر اس کے پاس ہی ہاتھ جوڑے، آنکھوں میں نمی لئے کھڑی تھی!

عزیز دوستو! میں اپنی طرف سے اور آپ کی محبوب آرٹسٹ پورنما کی جانب سے معافی مانگتی ہوں۔ آج پہلی بار آپ "لوگوں کی فرمائش پوری نہ کرپانے کا دکھ ہے اور دوگنا دکھ اس بات کا ہے کہ آج میری بیٹی کا دکھ، آپکے دکھ کی وجہ بنا ہے۔ پورنما دل کی مریضہ ہے، دل کے دورے نے ابھی ابھی دستک دے کر اسے ہمارے سامنے اس حال میں کھڑا کر دیا ہے۔ اس میں شاید آپ سب کی دعائیں اور نیک تمنائیں شامل ہیں، جو وہ آپ کے سامنے رقص کر پائی۔ اب آپ ہمیں اجازت دیں۔ پورنما کی ڈاکٹر بھی آ گئی ہے۔" ایسا کہتے ہوئے نرملا دیوی نے بیٹی کو سہارا دے کر اسٹریچر پر لٹایا، جو اسی وقت اسٹیج پر لایا گیا تھا۔ ڈاکٹر ممتا نے وہیں پر چیک اپ کا عمل شروع کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے بھاگ دوڑ مچ گئی۔ اسٹریچر ہسپتال کی گاڑی میں رکھتے ہی، گاڑی نے رفتار پکڑی اور آڈیٹوریم کے دروازے سے باہر چلی گئی۔ آگے آگے گاڑی اور پیچھے پیچھے چاہنے والوں کا قافلہ، سب کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھے ہوئے تھے۔ وہ چلتے رہے، آگے بڑھتے رہے جب تک کہ گاڑی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ بغیر ہونٹ ہلائے کی گئی دعا، ہارے ہوئے انسان کا

واحد سہارا ہوتی ہے، دل کی گہرائیوں سے نکلی یہ دعائیں ہر خالی دامن کو بھرنے کا واحد سچا اور مضبوط ذریعہ ہے، جہاں دل کی بات کہنے سے پہلے سن لی جاتی ہے۔ ہر اَن کہے سوال کا جواب دل کے ہر کونے میں اطمینان بخشتا ہے۔ ایسی !عبادت دوا سے پہلے دعا کی دولت سے مالا مال کر دیتی ہے

تھوڑی دیر میں ہال خالی ہو گیا، نہ کوئی آواز، نہ کوئی شور، بس خاموشی بکھری رہی، یوں لگا جیسے کوئی مندر سے، تو کوئی گرجا سے اور کوئی مسجد سے مالک کی رحمت کی دعا مانگ کر نکلا ہو، اس آرٹسٹ کے لئے جو اپنے رقص سے دلوں کی دھڑکنوں میں ہل چل کرتی رہی اور آج اس کا ہی دل اپنی بہکی بہکی چالوں کے ساتھ ہسپتال کی طرف جا رہا تھا۔

نرملا دیوی، آئی۔ سی۔ یو کے باہر اپنی بے چینیوں کے ساتھ مسلسل ٹہل رہی تھی۔ بیٹی کے درد کی ناقابل برداشت تکلیف سے وہ بخوبی واقف تھی۔ یہ کوئی پہلا موقع تو نہ تھا۔ پہلے بھی دو بار رقص کرتے ہوئے ایسا ہو چکا تھا۔ سب سے پہلے، جب پورنما سات سال کی تھی اور دوسری بار جب وہ میٹرک میں پڑھا کرتی تھی۔ پہلی بار ہی ڈاکٹر نے چیک اپ کر کے یہ اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ اس کے دل میں سوراخ ہے، جو اس کی بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ بڑھنے کا خطرہ رہے گا۔ ڈاکٹروں نے تو نرملا دیوی کو یہاں ٖ جب جب دل کی دھڑکن تیز ہو گی، اس کے دل پر دباو □ تک آگاہ کیا کہ رقص کا یہ شوق پورنما کے لئے خطرے سے خالی نہ تھا۔ رقص کے دوران دل کی دھڑکن کی رفتار اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ عام انسان کو بھی آکسیجن کی ضرورت پڑتی ہے۔ پورنما تو۔۔۔! اس حقیقت کو نرملا دیوی نے ماں ہو کر جانا، پل پل جیا اور سہا۔ ہر حقیقت سے سامنا کرتے ہوئے وہ اس بات سے بہت اچھی طرح واقف تھی۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ بات تو یہ رہی کہ وہ اپنی بیٹی کے لئے کچھ بھی نہ کر پانے کی بے بسی کو شدت سے محسوس کرتی رہی، خاموش آنسو بہاتی رہی، لیکن اس کا نہ علاج بن پائی، نہ کر پائی۔

پانچ سال کی عمر سے ہی پورنما نے اس فن کی تعلیم حاصل کرنی شروع کی۔ گانا اور ناچنا دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے، مگر جلد ہی اسے گانے کی اپنی خواہش کو چھوڑنا پڑا، کیونکہ گاتے وقت سانس روک کر سر لگانے میں دشواری پیدا

ہو رہی تھی اور موسیقی بغیر ریاض کے کہاں مکمل ہوتی ہے ؟ پور نما نے موسیقی تیاگ دی، مگر رقص سے خود کو کبھی بھی الگ نہیں کر پائی۔ ماں کے ہر دلیل کا جواب اس کے پاس تھا، "اگر میں جسم ہوں تو کوریوگرافی میری روح ہے، ل ِز اگر روح جسم سے جدا کر دی جائے تو جسم مردہ ہو جائے گا۔ اگر رقص مجھ سے چھڑا یا جائے گا تو میں بھی مر جاو□ گی۔" بس یہیں آ کر ہر دلیل کے سامنے ایک ماں تو نہیں، البتہ ماں کی ممتا ضرور ہار جاتی تھی۔

جب پور نما میٹرک میں تھی، تب الوداعی پارٹی میں رقص و موسیقی کا بھی انعقاد کیا گیا تھا۔ پور نما نے ماں اور ڈاکٹر کے مشورے کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے رقص میں شرکت کی۔ ریاض کرتے کرتے وہ تھک کر نڈھال ہو جاتی اور ہانپنے لگتی۔ جیسے محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے، اسی طرح پور نما کو بھی محسوس ہوا کہ زندگی کے ساتھ منسلک موت کا یہ سایہ بھی اس کے ساتھ ساتھ رہے گا، جب تک اس کی زندگی کی سانسیں سلامت ہیں۔ زندگی جینا بھی تو جنگ ہے اور مسلسل جوجھتے رہنا ایک جدوجہد کی طرح، جس کا سامنا کرنا میدانِ جنگ میں ہو یا آسائش کی سیج پر۔ اسی دلیل سے وہ خود کو، ماں کو تسلی دیا کرتی تھی۔ اسی جدوجہد کی راہ پر کبھی پیدل چلتے، کبھی دوڑتے، کبھی ہنستے ناچتے، کبھی اسٹریچر پر لیٹے، وہ اپنے اس اکلوتے شوق کو جدوجہد کا ایک حصہ مان کر بڑی جرات کے ساتھ آگے بڑھتی رہی۔ اس کے اسی جذبے کی پختگی پر، علاج کرنے والے ڈاکٹر بھی حیران ہوا کرتے۔

ڈاکٹر ممتا، اکثر پور نما اور اس کی ماں نرملا دیوی کے ساتھ پروگرام کے دورے میں بھی شامل رہتی تھی۔ کون جانے کب، کیسے غیر معمولی حالات میں اس کی ضرورت پڑ جائے۔ کبھی تو اسے لگتا تھا کہ شاید ابھی، ہاں بس ابھی، دل دھڑکتے دھڑکتے تھم جائے گا، رک جائے گا، لیکن ایسا آج تک ہوا نہ تھا۔ پور نما کا جسم اور اسکی روح۔ ایک تال، ایک لے پر، زندگی کے آہنگ پر رقص کرتے سانسوں کا ساتھ نبھاتے۔ روح بھی کبھی مرتی ہے ؟ اگر نہیں تو اس کے احاطے میں لیا گیا جسم کس طرح کمھلا سکتا ہے، جس میں ایسی امر روح سکونت رکھتی ہے، جو سانسوں کے ساز پر رقص کرتی ہے، ہر پل، ہر لمحہ، دن رات۔۔۔!

پورنما کی ایسی باتیں سن کر ڈاکٹر بھی حیران ہو جاتے تھے، جب وہ اپنی چاہت کو زندہ رکھنے کے لئے دلیلوں کے طور پر پیش کرتیں۔ ایسے موقعوں پر وہ مسکراتے ہوئے باہر آتے، نرملا دیوی کو یقین دہانی کرا کے اسے پورنما کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے کو کہتے۔ وہ بس ماں تھی، ماں جو اپنی ممتا کے آگے بے بس، کمزور تھی۔ کچھ نہ کر پانے کی بے بسی کے سوا، ایک کام جو وہ خلوص سے کیا کرتی۔ وہ ہے پورنما کے آس پاس رہتے ہوئے اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنا۔ وہ جانتی تھی کہ بیٹی جب جب زیادہ وقت ناچے گی، اسے پھر پھر اس دور سے گزرنا ہو گا، اذیت کو جھیلنا ہو گا، ان لمحات کو جینا ہو گا۔ یہی قسمت ہے۔

میڈم آپ مریض سے مل سکتی ہیں۔" اس نرس کی آواز تھی۔"

نرملا دیوی نے کمرے میں اندر آ کر بیٹی کے چہرے پر ایک نور دیکھا، لگا جیسے کسی نے اجنتا اے لورا کی مورتی میں جان پھونک دی ہو۔ پورنما کا ماتھا دمک رہا تھا، آنکھیں جذبے کی نمی سے اجلی، ہونٹوں پر زندگی کے اعتماد کے ساتھ ایک بھرپور مسکراہٹ، جیسے ابد سے آتی ہوئی دھن پر تھرکتی ہوئی اس دھڑکن جذبات میں ڈوبی ہو، جہاں جسم اور روح دونوں گھل مل گئے ہوں۔

نرملا نے تھوڑا آگے جھک کر اس کا ماتھا چومتے ہوئے کہا، "اگلے ماہ پورن ماسی کی رات کے لئے گرین انسٹیٹیوٹ والے "تاریخ مانگ رہے ہیں، ان سے کیا کہوں؟

وہی جو ہمیشہ کہتی ہو! تمہاری آشیش ہی میں تمہارے ہر خوف کو غلط ثابت کر کے، تمہاری ہر ناراضگی سے بچ جاتی" ہوں۔ لہٰذا آپ خوشی خوشی ہاں کر دو ماں۔ دو تین دن یہاں آرام، دو تین دن گھر میں آرام، پھر وہی سلسلہ وار پر رکنا، سانس لینا اور پھر منزل کی طرف آگے اور آگے چلتے رہنا ہی تو زندگی ہے۔ ماں، میری ¿ تھکاوٹ! ہر پڑاو □ پیاری ماں! چلنے دو، یوں ہی چلنے دو اس سلسلے کو۔ ہاں، ایک شرط ہے، میرے کامیابی میں تم ہی میری ہمسفر رہو،

تمہارے نقش قدم پر چلتے ہوئے میں زندگی کا سفر طے کروں۔ تم ہی میری کشتی اور تم ہی ناخدا ہو، تمہیں ہی اسے پار لگانا ہے!" کہتے ہوئے پور نمانے آنکھیں بند کر لیں، جیسے وہ واقعی آرام کی طلب گار ہو۔

چل پگلی، چل اب بس کر۔ جانتی ہوں کہ تو نیک اور علم والی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں، میں ہی تیری کشتی اور" تیری ناخدا ہوں۔ اب چپ رہ کر تھوڑی دیر آرام کر لے۔" کہتے ہوئے نرملا دیوی نے اس کی گدی پر پیار بھرا ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کی پیشانی کو چوم لیا۔ اس بات کا یقین سا ہوتا جا رہا تھا کہ پور نمانے اپنے جینے کے مقصد کو پہچانا ہے، !اور ساتھ میں جینے کے فن پر بھی مہارت حاصل کر لی ہے

☆☆☆

اپنا گھر

زندگی ایک طویل کہانی ہے، جس میں جھلساتی دھوپ بھی ہے، گھنی چھاؤں بھی ہے، اس کے پھیلے سایوں میں خوشی، غمی کے تانے بانے سے بُنی داستانیں بھی ہیں۔ یہ داستانیں کبھی ان سایوں سے بھی طویل ہو گئی ہیں، تو کبھی چھوٹی رہیں، کبھی مختصر سی اور تو کبھی نقطہ برابر ہی رہیں، جہاں ان داستانوں کے کرداروں کی زندگیاں بھی اسی نقطے میں سمٹ کر رہ جاتی ہیں۔

سندھی ادب کے معروف کہانی نویس جناب ایشور چندر کی تحریر شدہ کہانی "اپنے ہی گھر میں" پڑھنے کا موقع ملا۔ پڑھتے ہوئے معاشرتی اور خاندانی حالات سے واقف ہو کر میری سوچیں بھروسے اور بد اعتمادی کی دوئی میں جکڑتی چلی گئیں۔ کیا ایسا ہونا بھی ممکنات میں سے ہے، وہ بھی اپنے ہی گھر میں؟ جہاں جنم کرنی والی ماں، اپنی ہی شادی شدہ بیٹی کو

پہلی بار ایک ہفتہ کے لئے مے کے آنے کی دعوت بھیجتی ہے، وہ بھی اپنے شوہر کی منت سماجت کر کے، اسے منانے کے بعد۔ لڑکی بھی سسرال میں اپنا وقار بر قرار رکھنے کے لئے اپنے چار ماہ کے دودھ پیتے بچے کو لے کر میکے آتی ہے۔

گھر کے سامنے تانگہ رکتے ہی دروازے پر ماں ملتی ہے۔ روایتی انداز میں گلے لگانا، کیسی ہو، داماد جی کیسے ہیں؟ پوچھتے ہوئے اس کے لئے چائے بنانے ہوئے، باورچی خانے میں اپنی بے چے نیوں کے ساتھ تھاہ پاتی ہے۔ پھر کالج جاتے چھوٹے بھائی اور اسکول میں پڑھتی بہن سے پیار بھری ملاقات کرتے ہوئے گھر کے درو دیوار، کونوں، چارپائیوں پر نظریں گھماتے ہوئے پایا کہ سب کچھ ویسا ہی تھا، جیسا وہ چھوڑ کر گئی تھی۔

"۔۔۔ہوں۔۔ہوں۔۔۔" کھانسنے کی کچھ ناکام سی کوشش کرتے والد صاحب گھر میں داخل ہوئے۔ پلنگ سے اٹھ کر باپ کے سینے سے لگ گئی منّی۔

"بابا آپ کیسے ہیں؟ آپ کتنے کمزور ہو گئے ہیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" اور جواب میں والد صاحب نے تین چار سوالات اسکے سامنے رکھ دیئے۔

"ارے منّی تم بتاؤ کیسی ہو؟ داماد جی کیسے ہیں، آئے کیوں نہیں؟ اب تو منّی تم خود بھی ایک منے کی ماں بن گئی ہو، گھر گرہستی کیسی چل رہی ہے؟"

والد صاحب نے پہلے بولنے کی بھرپور کوشش کی۔

"بابا، سب بالکل ٹھیک ہیں۔ میں اور منّا آپ کے سامنے ہیں آپ کے پاس۔ تین سالوں تک یہاں آنے کا انتظار کیا اور آج یہاں ہوں، خوش ہوں ماں کو، آپ کو، بھائی اور بہن کو دیکھ کر۔ اور سنائیں آپ کی صحت کیسی ہے، کام کیسے چل رہا ہے؟" اتنا کہتے ہوئے منّی نے باپ کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا۔

،چائے پانی، ،ِ باپ نے اپنے کھر درے ہاتھوں سے اسے خود سے کچھ دور کرتے ہوئے کہا، ”میں ٹھیک ہوں، جاو □
”ناشتا کر لو۔

اتنے روکھے اور سخت رویے کی توقع نہ تھی منّی کو۔ اسے ایسا کیوں لگنے لگا کہ وہ سب کے سب اس سے کھنچے کھنچے سے تھے۔ پہلے دن چائے ناشتے کے بعد، پھر رات کو ہی سادہ سا کھایا۔ دوسرے دن اسے لگا ماں بھی اس سے خار کھار ہی ” تھی۔ منے کے لئے دودھ کے لئے پوچھا تو جواب دیا، ”تیرے بابا لانے گئے ہیں۔

عجیب و غریب رویے سے زیادہ عجیب تب لگا، جب منّا بھوک سے بلبلانے لگا اور دو گھنٹے سے دودھ لانے کے لئے نکلے ہوئے اسکے والد کا پتہ تک نہیں تھا کہ وہ کس سمت سے آنے والے ہیں۔ اسی وقت والد صاحب نے گھر میں قدم رکھے، جوتے اتارے، ہاتھ میں پکڑے دودھ کی تھیلی اسے تھماتے ہوئے کہا، ”منّی یہ دودھ لے کر جا باورچی خانے ”! میں، آج اسی سے کام چلانا

منّی حیران، تین برس بعد مے کے آئی، منے کے لئے دودھ کی تاکید۔۔۔۔۔۔ آگے کیا ہو گا، کیا دیکھنا پڑے گا، کیا سننا پڑے گا، اس انجانی سی سوچ سے وہ بے چین ہو گئی اور منے کو دودھ پلاتے پلاتے، انہیں سوچوں کو اوڑھ کر وہ بھی اسکے پہلو میں ہی لیٹ گئی۔ اپنے مے کے آنے کی خوشی رفو چکر ہو گئی۔

صبح اٹھی تو ماں نے گرم چائے کی پیالی کرتے ہوئے کہا، ”منّی چائے پی کر آنگن میں آنا۔ دھوپ میں بیٹھ کر باتیں کریں ” گے۔

کیوں کیا بات ہے ماں؟ بابا بھی چپ چاپ سے ہیں، آپ بھی خاموش سی۔ آخر ہوا کیا ہے؟ کچھ بتائیں بھی۔۔۔! ” ” کہتے ہی اسکی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

"ارے کچھ بھی تو نہیں۔ تُو آرام سے چائے پی لے، میں بھی گھر کا کام نبٹا لوں، پھر بیٹھ کر آرام سے باتیں کریں گے۔" ماں کا کہا ہر لفظ بغیر کسی مفہوم کے کانوں سے ٹکراتا رہا۔

کیا بات کرنی ہے ماں کو، کسی نوع کے مسئلے کا آغاز تو نہیں ہونے جا رہا ہے؟ بہن سے بھی پوچھا۔ لیکن "پتہ نہیں۔" کہہ کر وہ کتابیں سمیٹنے لگی۔ بھائی سے بات کرنے کی کوشش کی تو سننے کو ملا "مجھے پڑھائی کرنی ہے دیدی۔" اور پھر وہ دوست کے یہاں چلا گیا۔ ان تمام رویوں کے پیچھے کوئی تو مسائل سے لبریز گتھی تھی، جو وہ باوجود کوشش کے سلجھا نہیں پا رہی تھی۔ شاید ماں سے بات کرنے پر اسکی وجوہات کا کوئی مناسب اشارہ مل سکے۔

اس نے چائے پی، نہا دھو کر منے کو دودھ پلا کر اسے گود میں لئے آنگن میں رکھے لکڑی کے تخت پر بیٹھ گئی اور پھر ماں کو آواز لگائی۔ وہ "آئی □ ´ □ ´۔ آئی" کہتے ہوئے باورچی خانے سے ساڑی کے پلو سے ہاتھ پونچھتے ہوئے باہر آئی اور منّی کے سامنے ہی بیٹھ گئی۔

"ارے بتا منّی، داماد جی کا کام کیسے چل رہا ہے، مکان کی مرمت ہو گئی یا ابھی باقی ہے؟" کچھ اس نوعیت کے سوال وہ پوچھ بیٹھی۔

"ماں میں، منّا اور آپکے داماد جی بالکل ٹھیک ہیں۔ سسر جی کی ضعیف العمری کی وجہ سے کل انہیں ان کی بیٹی کے ہاں چھوڑ آئے، تاکہ وہ ان کی بھرپور طریقے سے دیکھ بھال کر سکے۔ اب آپ سنائیں ماں۔ کیا میرے آنے کی آپ لوگوں کو کوئی خوشی نہیں ہے۔ میری تو جان پر بن آئی تھی۔ جب بھی کوئی پوچھتا کہ ارے تم شادی کے بعد تین سال سے □ ں تو کوئی ایسا دور بھی نہیں، بس کچھ ہی ؍ میکے نہیں گئی ہو؟ تیج تہوار کو تو میکے سے بلاوا آ ہی جاتا ہے۔ اور تمہارا گاو فاصلے پر ہی ہے۔ یہ سن کر تو شرم کے مارے نہ میں مر پاتی، نہ جی پاتی۔ بتائیں نہ ماں ایسی کیا مجبوری ہے، جو آپ نے مجھے بلانے میں اتنے سال لگا دیئے۔" منّی آنسوؤں بھری آنکھوں سے ماں سے جواب طلب کرنے لگی۔

وہی تو میں بتانا چاہتی ہوں منّی۔ بہت اصرار کر کے تیرے باپ کو ہر سال تجھے بلانے کے لئے آمادہ کرتی رہی اور آخر" اس سال انہوں نے تجھے بلا ہی لیا۔ لیکن۔۔ لیکن کل سے۔۔۔" اتنا کہہ کر ماں نے اپنی آنکھیں اپنے پیروں کے انگوٹھوں پر ٹکا دیں۔

لیکن کل سے کیا ماں؟" منّی کا تجسس اب سارے بند توڑنے پر تیار تھا۔"

"کل سے تیرے بابا پوچھ رہے ہیں، منّی کب تک رہے گی۔ دو دن یا تین دن؟"

یہ سن کر منّی کو لگا جیسے اسے کسی نے بلندیوں سے اٹھا کر کھائی میں پھینک دیا ہو، جہاں سے اسے کہیں سے بھی تاریکی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اپنے اندر کی گہرائیوں میں ڈوبتی جا رہی تھی، اپنے وجود کو بکھرنے سے بچانے کی ہر کوشش جیسے رائیگاں ثابت ہو گئی ہے۔

منّی، برا مت ماننا بیٹا، تیرے بابا کی یہ مجبوری ہے۔ وہ ہم چاروں کو دن میں ایک وقت کی روٹی دینے کے لئے بارہ گھنٹے" اپنے بوڑھے کاندھوں پر تیس کلو سامان کے ساتھ ٹھیلے کو بیل کی طرح گھسیٹتے ہیں۔ آج وہ پانچ گھنٹے زیادہ کام کریں "گے۔ دودھ دے کر کہہ گئے ہیں، پوچھ لینا۔

سے بہنے لگے۔ ؛ کہتے ہوئے ماں کی آنکھوں سے لاچاری کے آنسو پورے بہاو□

بیٹے۔۔۔۔"اس سے آگے وہ کچھ کہہ نہ پائی۔"

منّی نے ماں کی بات کاٹتے ہوئے کہا، "بس ماں۔ میں آپ کی بیٹی ہوں۔ جیسا بھی ہے میرا اپنا گھر ہے، جیسی بھی ہوں، خوش ہوں۔ میکے میں آنے کی خوشی چاہی وہ مل گئی۔ آپکی ہاتھ کی چائے پی، رات کا کھانا کھایا۔ میں کل صبح ناشتے کے ں گی، پتا جی کو بتا دینا۔" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ؛ بعد گاڑی میں روانہ ہو جاو□

....

اس کہانی کے کرداروں کی اپنی اپنی مجبوری ہے۔ کچھ کہانیوں میں کردار خاموش رہ کر بھی بہت کچھ کہتے ہیں۔ اور کچھ میں ان کی گھٹن سب کچھ عیاں کر دیتی ہے۔

ان سبھی صورتوں پر معاشیات کا گہرا اثر ہے، بلکہ ایک طرح سے گرہن لگا ہوا ہے۔ کبھی کبھی اچھے الفاظ کے مفہوم کے پردے میں بھی برائی چھپی ہوتی ہے۔ کوئی بھی کسی کا دشمن نہیں، صرف رشتوں کی دیواروں میں حالات دراڑ ڈال دیتے ہیں۔ اور جب فاصلے بڑھتے ہیں تو باہمی اپنائیت، پیار کے دھاگے جیسے الفاظ بے مطلب کے ہو جاتے ہیں۔ انہیں تمام تر تخیلات اور حقائق کی کشمکش کے بیچ میں پھنسی منّی، صبح اٹھ گئی۔ باورچی خانے میں جا کر بچا ہوا دودھ گرم کیا، پھر ابھی وہ اپنے کپڑے سمیٹنے ہی لگی تھی کہ باپ کی آواز باہر سے آئی، "منّی کی اماں، باہر تانگے والا آ گیا ہے، بس ڈپو تک لے جائے گا اور پھر وہاں سے بس کا سفر ہے۔ جب منّی تیار ہو جائے تو بتا دینا۔"

منّی کو لگا وہ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک گئی ہو۔ اگر وہ نہ آتی تو کم از کم رشتوں کا بھرم تو بنا رہتا۔ اب تو جو آس کے دروازے کھلے تھے، وہ بھی وہ اپنے پیچھے بند کرتی جائے گی۔

پھر مزید وقت ضائع کئے، وہ اپنے بچی کھچی عزت کی پوٹلی اپنے اندر لئے باہر آئی۔ ماں کو گلے لگایا، بہن کو سینے سے لگایا اور بھائی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنے منے کو سنبھالتے ہوئے دہلیز کے باہر آتے ہی تانگے کی جانب بڑھی یہ کہتے ہوئے، "چلئے بابا۔"

باپ کے منہ سے ایک حرف نہ نکلا، نہ بیٹی کے لئے دعا، نہ آشیرواد۔ بس کسی نوع کی رسم نبھاتے ہوئے اپنے چار ماہ کے نواسے کو بیٹی کی گود سے لیا اور اس کا ماتھا چومتے ہوئے "خوش رہو" کہہ کر منّی کی جانب بڑھا دیا۔

منّی کے لئے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ یہ چومنا محبت کی علامت ہے یا رشتوں کی رخصت کا کوئی اشارہ!

اور تانگے والا گھوڑے کو چابک مارتا ہوا آگے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ منّی کی سوچ کی رفتار ان سبھی گاڑیوں سے بھی زیادہ تیز رفتار میں اسکے اپنے گھر کی طرف جا رہی تھی۔

☆☆☆

ماضی

سناٹے کے اس مقام پر شیلی حیران وپریشان کھڑی ہے بے حس و حرکت سی، صرف خلاؤں میں ہی دیکھ سکتی ہے۔ یہ وہی جگہ تھی، اس کی اپنی سسرال۔ گھر میں گھر والوں کے نام پر تھے، اس کے شوہر راہول، انکی ماتا جی روچنا دیوی اور وہ خود۔ دو برس بعد گھر میں خوشیاں کھل اٹھیں، جب گھر کا چشم و چراغ روہت، اپنی ماں شیلی اور دادی روچنا دیوی کی گود میں کلکاریاں مارنے لگا۔

وہ اپنے بیٹے کی نگہداشت میں مگن سی ہو گئی اور یہیں اس نے ماضی کی زمین پر مستقبل کے بیج بوئے۔ وہی مستقبل اس کا "آج" بن کر کھڑا ہے اور وہ خود سوچ کی گہرائیوں میں گم صم، اپنے ماضی کی پرچھائیوں سے آتی ان سسکتی آوازوں روہت مجھے دے دو۔" دسہرے کے موقع پر پنڈال ہ کو سن رہی ہے۔ "بہو آؤ، یہاں میرے پاس آکر بیٹھو۔ لاو □ کی اُس بھیڑ میں اپنے پاس کچھ جگہ بناتے ہوئے روچنا نے اپنی بہو شیلی کو آواز دی۔

ممی میں یہیں پیچھے کھڑی ہوں، روہت ان کے پاس ہے۔۔" کہہ کر شیلی آگے بڑھ گئی اور تاریکیوں کے سائے میں گھری روچنا، بہو کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اسے نجانے کیوں یہ احساس ہونے لگا کہ وہ جب بھی اپنی بہو کو قریب لانے کی کوشش کرتی ہے، وہ اتنی ہی شدت سے اس سے دور چلی جاتی ہے۔ یادوں کی ان خندقوں میں اس کے ساتھ رہ جاتے ہیں، فقط کچھ اذیت ناک احساسات، جو تنہائی میں اسے تشنع کرتے اور وہ اس نازک رشتے کی تپش کو کم کرنے کے لئے کچھ غیر مرئی آنسو بہالیتی۔

یادوں کی ان خندقوں میں روچنا کو اپنا گزرا ہوا ماضی یاد آیا، جب وہ راجیو ماتھر کی بیوی بن کر اس گھر میں آئی تھی۔ گھر میں گھر کے افراد کے نام پر تھے، اس کے شوہر راجیو، انکی ماتا جی جنجا نیشوری دیوی اور وہ خود۔ سہاگ رات میں راجیو نے اسے گھر کی تمام تر معلومات دیتے ہوئے ایک ذمے داری روچنا کو بے حد اعتماد کے ساتھ سونپی، یہ کہتے ہوئے کہ، "آج سے میری ماں تمہاری ماں ہے اور وہ تمہاری ذمے داری ہے۔ ماں نے پتا جی کے بعد مسائل و مصائب کے پہاڑوں کا سامنا کرتے ہوئے اسے آج اس مقام اور اس درجے پر کھڑا کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اب تم اسے اپنے گھر میں، اپنے دل میں وہ مقام دو، جو آج کی نئی نسل دینے سے چوک جاتی ہے۔ اس کا احترام میرا احترام ہوگا روچنا۔" اور روچنا نے بات کو گرہ باندھ کر اپنے طرز عمل سے ماں کو پیار و احترام دیتے ہوئے، ہر پل، ہر کام میں اس کا بڑا پن برقرار رکھا۔ اور اب اپنے ماضی کے جھروکوں کا، آج کے ان سونے لمحات سے مقابلہ کر رہی ہے۔

....

یہ درد بھی عجیب ہے، اپنے اظہار کے ذرائع ڈھونڈ ہی نکالتا ہے۔ ورنہ تنہائی کی اس دھند کی گھٹن میں جینا محال ہوتا۔ "ماں ہم 'مال' جارہے ہیں، آپ بھی ہمارے ساتھ چلئے!" یہ سنتے ہی روچنا کے دل کی دہلیز پر امید کے دیے جھلملانے لگے۔ دل ہی دل پر امیدی لئے وہ بہو بیٹے کے ساتھ مال پہنچی۔ لیکن وہاں پہنچ کر شیلی ایک ٹرالی لے کر دکانوں کی بھول بھلیوں میں کھو گئی اور اسکا ساتھ دینے کے لیے بیٹا راہول بھی چلا گیا۔ بس ایک بار پھر وہ اس شور میں، ہجوم کا حصہ بن

کر رہ گئی۔ یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا، پہلے بھی کئی بار وہ اسے یونہی بھیڑ میں تنہا چھوڑ کر گھنٹوں کے لئے غائب ہو جاتے۔ اس بار بار کے چھلاوے سے اچاٹ ہو کر روچنا ان کے لوٹ کر آنے کے انتظار میں ایک بینچ پر بیٹھ گئی۔ اس دن جب گھر واپس آئی تو تن کے ساتھ ساتھ اس کا من بھی بیمار سا ہو گیا۔

دل بھی کب کسی کا خالی بیٹھا ہے، ساتھ دینے کے لیے سوچوں کے خزانے لٹا دیتا ہے۔ روچنا کا دماغ بھی تیز رفتاری سے چوٹ کھائے ہوئے دل کی ان الجھنوں سے منسلک رہتا۔ اسے پتہ ہی نہیں پڑا کہ وہ کب سوچوں کی سیج پر سو گئی۔ اٹھی تو ایک شفاف سوچ اس کے ساتھ تھی۔ اب اسے باہر جانے کے بجائے گھر کی تنہائی میں پڑے رہنا زیادہ گوارا لگا۔ جب کبھی بھی بیٹا آ کر ساتھ چلنے کے لیے کہتا تو وہ نہ جانے کا کوئی نہ کوئی بہانہ بتا کر گھر میں رہ جاتی۔ کم سے کم بن مانگے چوٹ کے صدمے سے تو بچی رہتی۔ "ماں کبھی ہمارے ساتھ بھی باہر چلا کرو، ہمیشہ گھر میں بیٹھی رہتی ہو۔" ایک دن راہول نے آ کر کہا۔ جواب میں روچنا کا پھر وہی ایک نیا بہانہ رہا۔ اب شیلی کو احساس ہوتا جا رہا تھا کہ اس کی ساس جو اسکی ہاں میں ہاں ملانے کے لئے ہمیشہ تیار رہتی تھی، نجانے کس وجہ سے بہت اصرار کرنے پر بھی ان کے ساتھ کہیں آتی جاتی نہیں۔ ایک دن شیلی خود آئی اور ان سے ساتھ چلنے کے لئے درخواست کرنے لگی۔ لیکن روچنا کا من اب تنہائی میں سکون پانے لگا تھا۔ اب من کے جذبات میں اتار چڑھاؤ سے کنارہ کرنے کی عادی ہونے لگی تھی۔ لہٰذا شیلی ۔میں تم دونوں کے ہٰ کی طرف دیکھتے ہوئے پر سکون لہجے میں کہنے لگی، "نہیں بیٹے آپ اور راہول دونوں ہو آو□ پیچھے چلتے چلتے بہت تھک جاتی ہوں۔" سونی آنکھوں سے اپنے بیٹے راہول کی جانب دیکھتے ہوئے کہا، جو اسی وقت آ کر شیلی کے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ روچنا کو لگا جیسے وہ اپنے آپ سے بات کرتی رہی، خود کہتی رہی، خود سنتی رہی۔

ماں آیئے نہ!" اس بار راہول نے بھی شیلی کی بات میں بات ملائی۔"

بیٹے نہ جانے کیوں اس چار دیواری میں مجھے سکون سا ملتا ہے۔" اور اپنی سوچوں کے ہجوم میں گم صم روچنا خود میں " سمٹتی چلی گئی۔ شاید وہ بخوبی جان گئی تھی کہ باہر کی بھیڑ میں تنہا رہ جانے سے، گھر میں اکیلا رہنا کہیں زیادہ بہتر ہے۔ اَن

کہے لفظوں کی بازگشت شیلی کے دل پر دستک دیتی رہی۔ وہ اتنی بھی ناسمجھ نہیں تھی، جو بات کی گہرائی میں لپٹی تلخ سچائی کو نہ جان پاتی۔ اپنے طرزِ عمل سے پیدا ہوئے بیجوں کی کونپلوں دیکھ رہی تھی، اپنے نادان رویے کی فصل کو دیکھ رہی تھی، جو لہلہانے کے بجائے، سوکھ کر، مرجھا کر، کملا رہی تھی۔ یہ احساس ناگ پھنی کی طرح اس کی آنکھوں میں، اس کے دل میں اگ رہا تھا۔ اب وہ جب کبھی اپنے شوہر اور ننھے بچے کے ساتھ خریداری کرنے مال میں جاتی، تو اس کا من اسے اس قدر ڈستا کہ وہ اسکے ڈنگ سے خود کو بچا نہ پاتی۔ اپنی ہی سوچوں کے تانے بانے سے بُنے ہوئے جال میں وہ پھنس گئی تھی۔ اسے احساس ہونے لگا، جیسے اس کی ساس روچنا اب اس کی آواز سنتی ہی نہیں یا سننا ہی نہیں چاہتی۔ اس کے دل کے اندر گھسنا شیلی کے لیے مشکل ہوا جا رہا تھا۔ ایک دن روچنا نے ایک تھیلے میں کپڑے اور ضرورت کا سامان رکھتے ہوئے شیلی سے کہا، "بہو آج میں اپنی سہیلی کانتا کے گھر کیرتن کے لئے جا رہی ہوں، دو دن اس کے پاس رہ کر لوٹوں گی۔" شیلی نے ویران نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ کچھ کہے اس سے پہلے ہی روچنا نے اپنے کپڑوں کا بیگ اٹھایا اور تھکے ہارے قدموں سے گھر کے باہر جانے لگی۔ شیلی کو لگا جیسے وہ اپنا مستقبل دروازے سے باہر جاتا ہوا دیکھ رہی ہے۔

"ماں رکیں، میں آپ کو کار میں چھوڑ آتی ہوں۔" ادھ کھلے لب کہہ کر بھی نہ کہہ پائے۔ اسکی دھیمی آواز روچنا کے کانوں تک نہ پہنچ پائی۔ اس دکھ نے اس کے کلیجے میں خلا سا پیدا کر دیا، جہاں گھٹن کے سوا کچھ نہ تھا اور اس گھٹن کا دھواں آہستہ آہستہ اسکے وجود کو گھیرتا جا رہا تھا۔ دھند کے اس جال کو وہ توڑنا چاہتی تھی۔ مگر روچنا نے اپنے آپ کو اس قدر پُرسکون اور نارمل انداز میں ڈھال لیا تھا کہ اسے خاندان کی ہلچل میں بھی سناٹا لگنے لگا۔ اسے تنہائی سے ہو گیا تھا اور وہ اکیلے رہنے کے موقع کو تلاش کرتی، بہو سے دور، اپنے بیٹے سے بھی دور، جہاں اس کی آنکھیں ﻧ لگاو□ کبھی ان میں تعلق اور اپنائیت کی آس نہ ٹٹولیں۔ ان میں، جو اسے کہیں بھی، کسی بھی جگہ تنہا چھوڑ کر چلے جانے کی حماقت کر سکتے ہیں۔

یہ سلسلہ کئی مہینے چلتا رہا۔ روچنا آئے دن اکیلی کبھی کیرتن میں چلی جاتی، کبھی باہر باغ میں گھنٹوں جا بیٹھتی اور قدرت کی خوبصورتی کی بے مثال تصویر کے ساتھ گھل مل جاتی۔ اب شیلی کو ساس کا اس طرح گھر میں موجود ہو کر بھی غیر موجود ہونا کھلنے لگا۔ اس کی غیر موجودگی اور بھی زیادہ محسوس ہونے لگی۔ اسے احساس ہوا کہ ساس کو وہ کبھی بھی اپنی ماں سمجھ نہیں پائی۔ یہی سوچ شاید دوریاں بڑھانے میں مددگار ہوئی تھی۔ اگرچہ روچنا ہمیشہ گھر کے کام میں، باورچی خانے میں اس کا ہاتھ بٹایا کرتی، اسکی غیر موجودگی میں کھانا بنا کر رکھتی۔ کام وہ اب بھی کرتی اور ہو جانے پر اپنے کمرے میں اکیلی پڑی رہتی۔ گھر میں کوئی ہو اور نہیں ہو، کوئی آس پاس ہو اور نہیں ہو، تو کیسا محسوس ہوتا ہے؟ شیلی کو اس بات کا مکمل طور پر احساس ہوا۔ اپنی نادانیوں کا نتیجہ سامنے سر اٹھا کر اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ ایک دن اچانک وہ اپنی ساس روچنا کے کمرے میں چلے گئی، جو کہیں کیرتن پر جانے کی تیاری میں لگی ہوئی تھی۔

ماں آج میں بھی آپ کے ساتھ کیرتن میں چلوں گی۔" اور روچنا اسکی نم آواز سن کر چونکی۔ سر اٹھا کر اوپر دیکھا، شیلی " کا سارا وجود بھیگا بھیگا سا تھا۔ وہ دوپٹے کے کونے کو لپیٹے ٹتے ہوئے جواب کے انتظار میں کھڑی رہی۔ کچھ سوچ کر روچنا ۔ وقت ہو گیا ہ نے کہا، "اچھا بہو، مجھے روہت کے کپڑے لا دو، میں اسے تیار کرتی ہوں اور تم جا کر جلدی تیار ہو آو □ "ہے۔

کیرتن کے مقام پر پہنچ کر روچنا نے ایک مناسب جگہ منتخب کی تو ایکدم برابر میں ہی شیلی بھی بیٹھ گئی۔ اپنے بیٹے روہت کو ساس کے پاس بٹھانے کی کوشش کی تو روچنا نے جھٹ سے پوتے کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

!ایک ان کہی اور پیچیدہ الجھن نے جیسے انتہائی لطیف انداز میں گرہ کشائی کر لی ہو

☆☆☆

کھوئی ہوئی پہچان

مجھے گھر جانے کی ضرورت ہے، اس سے پہلے کہ میں بھول جاؤں کہ میں کون ہوں، کہاں سے آئی ہوں، اور جانا کہاں ہے؟ جو میری پہچان کا سبب تھے، وہ بھی نہ جانے کہاں کھو گئے۔ میرا مطلب میرے والدین سے ہے۔ ہر کسی کو اس دنیا میں لانے والے، اس کو چھوڑ کر اس پار کی کسی اور سلطنت میں گم ہو جاتے ہیں۔

ایک انسان کو غائب ہونے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے؟

والد کے بعد ماں بھی چلی گئی، جانے کہاں کس دیس میں اور یقیناً مجھے بھی اسی گھر جانا ہے، ان سبھی کو چھوڑ کر جانا ہے، جن کی میں نے کبھی پرواہ کی، جنہیں چاہا، جنہیں پیار کیا۔۔۔ لیکن کہاں، میں نہیں جانتی۔

ماں کی موت کے بعد اسی پیار کو پروان چڑھایا میری چاچی نے۔ چاچا تو نہیں رہے۔ چاچی تو ایک دوسرے گھر کی بیٹی تھی، جو بیاہ کر کے اس گھر میں لائی گئی تھی۔ تب میں بہت چھوٹی تھی۔ گھر میں ہنگامہ برپا تھا، شور شرابہ عروج پر تھا۔

چاروں جانب شادمانی بھری رسمیں تھیں، میں جیسے اس ہجوم میں کھو سی گئی۔ماں نے کہا تھا، ''منی آج نئے کپڑے پہنے گی، ناچے گی، گائے گی، خوشیاں منائے گی۔'' وہی سب کیا جو ماں نے کہا تھا، کیونکہ چاچا کی چاچی سے شادی ہو رہی تھی۔ خاندان میں ایک فرد کا اضافہ ہونے جا رہا تھا۔ اسی گھریلو ماحول میں، میں دیکھتے ہی دیکھتے بڑی، مزید بڑی ہوتی گئی۔ بہت کچھ سمجھتی رہی اور پھر اچانک خاندان سکڑنے سا لگا۔ والد کے بعد ماں، ماں کے بعد چاچا، بس غائب سے ہو گئے۔ خاندان کے نام پر بچے تھے بس دو لوگ، میں اور چاچی۔

چاچی میری ماں تو نہیں بن پائی، لیکن سوتیلے پن جیسا بھی کوئی تلخ رویہ نہیں تھا۔ میری خیر خبر رکھتی، میری ضروریات کا خیال رکھتی۔ کیسے نہ رکھتی؟ سب کچھ تو اسی کے ہاتھ میں تھا۔ حویلی کا وہ حصہ جو والد صاحب اور چاچا کے نام تھا، یہ ہال، چولہا چوکا سب کچھ اب اسکے کنٹرول میں تھا۔ اور ایک طرح سے میں بھی۔ میرے بڑی ہونے کے ساتھ ساتھ پابندیوں کی فہرست بھی طویل ہوتی گئی۔

اری شام ڈھلنے سے پہلے گھر آ جانا زیادہ دیر نہ کرنا۔'' چوکھٹ کے اس پار جانے سے پہلے اسکے حکم نامے کی پیروی کا'' پیغام آتا۔ میرے لئے ہدایت در ہدایت کی کھینچی ہوئی لکشمن ریکھا، کسی بھی طرح اس لکشمن ریکھا سے چھوٹی نہ تھی، جو ریکھا، لکشمن جی نے سیتا کے لئے کھینچی تھی۔

معلوم نہیں میں ان ہدایتوں پر کھری اترتی تھی یا نہیں، پر مجھے ایک دباؤ کا احساس ضرور ہونے لگا۔ لگا میری زندگی کا دائرہ ہی تنگ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ گھر کی چھت تو تھی، پر کھلا آسمان نہ تھا۔ اسی کی کمی دل کے نہاں خانوں میں کہیں نہ کہیں نشتر کی طرح دھنسی رہتی۔ کیسے پورا ہو یہ خواب؟ سبھی اپنے تو مجھے چھوڑ گئے، جاتے ہوئے کچھ سوچا ہی نہیں میرے بارے میں، نہ میرے لئے کچھ کرنے کے ضمن میں یا شاید وقت نے ہی انہیں مہلت نہیں دی۔ وقت کے ہی شکنجے میں زندگی جینا شاید انسان کی مجبوری ہے۔

''کہاں سے آ رہی ہو؟ کچھ بتا کر بھی تو نہیں جاتی۔ جب جی چاہا چلی جاتی ہو، اور جب جی چاہا لوٹ آتی ہو۔ ''

"سہیلی کے پاس گئی تھی، بتا کر تو گئی تھی۔ "

آنے کا کہہ کر نہیں گئی۔ چاچی کے ساتھ کچھ لمحے گذار کر اکتا جاتی ہو۔ دیدی ہوتی تو یہ ذمے داری میرے سر نہ "
چڑھتی۔"

میں کچھ رک کر سوچتی رہی کہ یہ کون سی ذمے داری کی بات ہو رہی ہے؟

"چاچی کس ذمے داری کی بات کر رہی ہو؟"

ارے وہی جو ایک لڑکی کے بڑے ہونے پر، والدین کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ آج دیدی اور بھائی جان ہوتے تو" میں کیوں یہ سر درد مول لیتی؟ تیرے بیاہ کے بارے میں سوچتی؟ لیکن اوپر والے نے میری مشکل آسان کر دی۔ آج خوشیوں کا دروازہ کھلا ہے۔ گھر میں آج پھر سے ہنگامہ ہو گا۔ شور شرابہ ہو گا، خوشیاں ناچیں گی، زندگی کا چمن مہکے گا۔" اور چاچی نے جیسے دونوں ہاتھوں سے میرا صدقہ اتارتے ہوئے اپنی کسی من چاہی خوشی کا اظہار کیا۔

خیالات کے ہجوم میں، میں کچھ سمجھ نہ پائی۔

میرے ساتھ۔" یہ کہہ کر چاچی مجھے اپنائیت کے دھاگوں سے کھینچتی ہوئی، ٖ کھڑی کھڑی کیا سوچ رہی ہو، آو□ "
ادھیڑ بن کی غلام گردشوں سے گزارتے ہوئے، اندر بڑے صحن میں لے آئی۔

"یہ لو شگن آیا ہے، تیری منگنی اور شادی کا۔"

"کیا۔۔؟"

ہاں لڑکے والے ایک مہینے سے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ بیاہ تو تیرا کہیں نہ کہیں طے کرنا تھا۔ یہ لوگ بھی مسلسل زور "
دیتے رہے اور آج شگن لے کر آ ہی گئے کہ روپا اب ہماری ہوئی۔"

کون ہیں یہ لوگ چاچی ؟" تشویش سے سامنے رکھے ہوئے آئینے میں اپنے اور چاچی کے عکس کو دیکھتے ہوئے میں نے "
پوچھ لیا۔

اری نادان لڑکی، اور کون! یہی تو لڑکے والے ہیں۔ اب تیرا اپنا گھر بسنے والا ہے۔ تم ہو گی، تمہارا گھر والا ہو گا، اور پھر "
نئی گرہستی کا آغاز ہو گا۔ یہی تو ہر ایک لڑکی کی زندگی کا ایک اہم ترین حصہ ہوتا ہے، جب وہ لڑکی سے ایک گرہ لکشمی
بن جاتی ہے، گھر کی مالکن بن کر اپنے گھر خاندان کو آگے بڑھاتی ہے۔

میں اور میرا گھر، میرا خاندان، ایک خواب سا لگا۔ دل تو چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر کہوں "آپکی شادی کے بعد تو ہمارے گھر
میں کوئی آبادی کے آثار نظر نہیں آئے۔ سب کے سب کھو گئے ہے، باقی میں بچی ہوں، اسے بھی تم اپنی غرض کی
سولی پر چڑھانا چاہتی ہو۔ چاچی، کیوں مجھے اپنے ہی اس گھر میں اپنے ساتھ کچھ وقت گزارنے کی اجازت
"!نہیں۔۔۔۔۔

کہاں کھو گئی؟ جا جلدی سے ہاتھ منھ دھو کر کوئی اچھا سا جوڑا پہن لے۔ میں تب تک کچھ ناشتے کی تیاری کرتی ہوں۔ "
"یہ کہہ کر چاچی کچن کی جانب مڑی اور میں اپنا سامنہ لے کر غسل خانے کی طرف بڑھی۔ میری سوچ کو سمجھ تک
پہنچنے میں نجانے راہ کے اور کتنے روڑے پار کرنے تھے۔

منہ دھوتے ہوئے میں نے دل اور دماغ کو تکرار کی کیفیت میں پایا۔ میں خود اپنی ہونے سے پہلے، کسی اور کی کیسے ہو
گئی؟ یہ کیسی سازش ہے؟ یہ کیسی روایت ہے کہ بغیر کسی بات کے، صلاح مشورے کے، کسی اور کی ہو گئی، جیسے میرا کوئی
وجود ہی نہیں ہے۔ اندر کے سناٹے میں کچھ تھر تھرایا۔۔۔۔

یقیناً اب سوچ نہیں، سمجھ سے کام لینے کا وقت آیا تھا۔ چاچی کے پھوپھا کے اکلوتے بددماغ، بگڑے بیٹے سلیمان کے
ساتھ میرا پلو باندھنے کی سازش تھی یہ۔ سلیمان ایک نامی گرامی غنڈہ، جو کچھ لفنگوں کے ساتھ دن تمام آوارہ گردی

کرتا، لڑکیوں کے ساتھ بیہودگی کرتا، بستی میں لوگوں کا جینا حرام کرر کھا تھا اس نے۔ اسکے ساتھ زندگی گزارنا محال ہو گی، جسکا نام سنتے ہی لوگ اسکے مرنے کی دعائیں کرتے ہیں۔

ں۔ اب نہ میرا خود پر اختیار ہے، میں اتنی بے بس بھی نہیں ہوئی ہوں کہ اپنے لئے، اپنے بچاؤ کے لئے کچھ نہ کرپاو□ مجھے گھر نہیں، گھر کے باہر جانے کی ضرورت تھی۔ اپنی بننے کی امید بعد میں کھوج نکالوں گی، ابھی تو گھر سے باہر نکلنے کی امید باقی تھی، وقت گزرتے ہی یہ امید بھی ناامیدی میں ڈوب جائے گی۔ میں ایسا قطعی ہونے نہیں دوں گی۔ میں اپنی ں گی، اسکے ساتھ جو انسانیت کے دائرے میں رہتے ہوئے مجھے، میرے وجود کو سبھی نہ پہچان پا کر اپنا گھر بساو□ خوبیوں و خامیوں کے ساتھ اپنائے گا۔

....

اسی ادھیڑ بن میں، میں نے ایک تھیلی میں کچھ ضروری چیزیں لیں، بنا کسی آواز کے گھر سے باہر نکلی اور ایک سمت کی جانب تیز رفتار سے دوڑتی ہوئی ایک میدان میں موجود روشنیوں کے ہجوم کے سامنے آکر رکی۔ میلہ لگا ہوا تھا، شور تھا، لوگوں کی بھیڑ تھی۔ اسی میں کھو جانے کی امید تھی۔ یہی سوچ کر میں اس بھیڑ کا حصہ بنتی چلی گئی۔ آگے کیا ہو گا، کیا نہیں ہو گا ہر خیال کو رَد کر کے، خود کو نظروں سے بچاتی، اپنے آنے والے ٹھکانے کے بارے میں سوچتی رہی۔

....

زندگی اب ایک ایسے موڑ پر آکر رکی ہے، جہاں اپنی کھوئی ہوئی پہچان کی تلاش میں مڑتی ہوئی راہوں پر چلنا، ایک مجبوری بن گئی۔ یہ بھی یاد نہیں آتا کہ میں کس زمانے میں غرق ہو گئی تھی اور اب یہاں ہوں تو اس حقیقت سے انجان کہ میں کہاں ہوں، کس کے ساتھ ہوں۔ اور جسکے ساتھ ہوں وہ میرا کون لگتا ہے؟

آخر کیاہے اس میں، جو میں چاہ کر بھی اسکے ساتھ جی رہی ہوں۔ بدترین اور نامناسب ماحول کے درمیان ایک بے ترتیب زندگی، آس پاس کی ان چاہی، میلی کچیلی، بدبودار، بکھری ہوئی بستی، پھر بھی جی رہی ہوں۔ موت کا انتظار قطعی نہیں مجھے۔ اگر وہ نامراد آ بھی گئی تو میں اسے خود پر شاید حاوی ہی نہیں ہونے دوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ میری اس دلدل میں دھنسی زندگی کو دیکھ کر خود ہی مجھ سے کنارہ کر جائے۔

ارے تم یہاں اس طرح اندھیرے میں کیوں بیٹھی ہو؟ چلو گھر کے اندر۔" یہ شکور کی آواز تھی۔ "

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔" خود فراموشی جیسے اسکی ردا بن گئی ہو۔ شکور احمد میاں کو یہ پتہ ہی نہیں چل پا رہا تھا کہ وہ سن" بھی رہی ہے یا نہیں۔ اسکے حالات کبھی اوہام کو حقیقی سمجھنے پر مجبور کرتے تو کبھی حقائق کو اوہام۔

میں تم سے بات کر رہا ہوں سلمیٰ۔ شام ڈھل کر رات ہونے کو آئی ہے۔ اب روشنی میں اندر چل کر بیٹھو۔ تمہیں " یوں باہر بیٹھے دیکھ کر آنے جانے والوں کی نظریں اس چوکھٹ پر اٹھتی رہتی ہیں۔" شکور بولتا رہا اور اسے اپنی ہی آواز، جیسے کہیں دور سے کسی شیشے سے ٹکرا کر لوٹتی ہوئی محسوس ہوتی، ٹوٹتی ہوئی، بکھرتی ہوئی۔

وہ تھک گیا تھا اسے آوازیں دیتے دیتے۔ امید بھرے ارادے سے خود کو امید دلاتا رہا کہ کسی دن شاید وہ سن لے، چہرہ اٹھا کر پلکیں جھپکے اور شاید اسکی آنکھوں کی پتلیاں پھر سے رقص کرنے لگیں۔

....

انہیں آنکھوں کا تو پانچ مہینے پہلے وہ قائل ہوا تھا، جب پہلی بار وہ میلے میں اس سے ٹکرایا تھا۔ اسکے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی کپڑے کی تھیلی نیچے گر گئی، جسے اٹھانے کے لئے دونوں فوراً جھکے۔ پہل کس نے کی پتہ نہیں، لیکن جب جھکی ہوئی نظریں ملیں تو مقناطیسی کشش کے ساتھ۔ نظریں نہ یہ ہٹائے، نہ وہ۔ دونوں ایک ٹک، ایک دوسرے کی آنکھوں سے بولنے لگے۔

شکور احمد نے خود کو سنبھالا۔ لڑکی نے اپنی آنکھیں اٹھا کر پلکیں جھپکیں اور پھر اسکی آنکھوں کی پتلیاں رقص کرنے لگیں۔ اور وہ اس طرح کھکھلانے لگی، جیسے اس نے کوئی عجوبہ دیکھا ہو۔ شکور کو وہم ہوا کہ نجانے اسکی صورت کو ایسا کیا ہوا ہے، جسے دیکھ کر وہ ہنس پڑی۔ ہڑبڑاہٹ میں اس نے قمیض کو اوپر کر کے چہرہ پونچھ لیا، پھر ہاتھوں سے اپنے چہرے کو ملنے لگا۔

اچانک اسے محسوس ہوا جیسے کسی شور کے غبار نے ان دونوں کو گھیر لیا ہو۔ چار پانچ لوگ تھے کالے کپڑوں میں، سروں پر ٹوپیاں، جو آنکھوں اور پیشانیوں کو ڈھک رہی تھیں۔ ان میں سے دو لڑکی کو پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کچھ فاصلے پر کھڑی کار کی طرف لے جا رہے تھے۔ اور دو شکور احمد کے ہاتھوں کو پیچھے کی جانب موڑ کر قابو میں رکھنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ پانچواں بھاگ کر کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا تھا۔ بات کچھ کچھ شکور کو سمجھ میں آئی، اسکا دماغ تیزی سے چلنے لگا۔ تاخیر ہو، اس سے پہلے اس نے اپنی مضبوط ٹانگوں کا استعمال کر کے دونوں کو پچھاڑا اور خود کار کی سمت دوڑا۔ لڑکی کو کار میں دھکیلنے سے پہلے ہی اس نے ان دونوں سے ہاتھا پائی کر کے، لڑکی کو دائیں طرف بھاگنے کا حکم دیا۔ جیسے ہی وہ بھاگی، پیچھے والے دونوں نوجوان بھی اسکی جانب لپکے۔ لڑکی، چیتے کی رفتار سے خود کو خطرے کے دائرے سے نکالنے کے لئے بتائی گئی سمت میں بھاگتی رہی۔ کچھ ہی پلوں میں شکور، دونوں جوانوں کو چاروں خانے چت کر کے اسی سمت کی جانب لپکا۔ اب اسکے سامنے تین پرچھائیاں تھی، لڑکی سے کچھ ہی فاصلے پر دو جوان، وہ خود ان دونوں کے پیچھے۔

ایک دہاڑ مار کر اس نے ایک پر چھلانگ لگائی اور ہوا سے باتیں کرتا ہوا ان جوانوں سے بھڑ گیا۔ جوش میں آکر مضبوط ٹانگوں سے دونوں جوانوں کو نڈھال کر دیا۔ لڑکی بھاگتے بھاگتے تھک کر چور ہو کر لگ بھگ بیہوش ہو کر گرنے ہی والی تھی کہ شکور نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں بھر لیا۔ بڑی مشکل سے اسے قریب کے ڈھابے تک لے جا کر ایک گلاس پانی لے کر اسکے منہ پر چھڑکا۔ اسے کرسی پر بٹھا کر خود بھی اسکو سنبھالتے ہوئے پاس کی کرسی پر بیٹھا اور روٹی

ساگ اور چائے کا آرڈر دے کر اسے بغور دیکھنے لگا۔ نکھری ہوئی رنگت، گلابی ہونٹ، کجراری آنکھیں، گلے میں کالے موتیوں کی مالا، بدن پر بھورے رنگ کا سوٹ، لیکن پاؤں ننگے تھے۔ شاید بھاگتے ہوئے اس کی چپل کہیں چھوٹ گئی تھی۔

کچھ دیر میں لڑکی نے آنکھیں کھولی اور شکور کی جانب اجنبی پن کے ساتھ دیکھنے لگی۔ اب اسکی رقص کرتی ہوئیں پتلیاں تھم گئیں تھیں۔ ان میں کسی طرح کا کوئی احساس نہیں تھا۔ اسکی آنکھیں کھلی تو تھی، لیکن پتھرائی ہوئی، پتلیاں بنا کسی حرکت کے۔ یہ کیا ہوا اپل میں شکور سوچنے لگا۔ وہ تو اسکی آنکھوں پر دل نثار کر بیٹھا تھا۔ وہ جوان تھا، گرم خون تھا، اکیلا رہتا تھا، لیکن جوش میں ہوش کھونے والوں میں سے نہ تھا۔

اتنے میں ویٹر روٹی ساگ لے آیا۔ شکور نے اسکا ہاتھ پکڑ کر تھالی میں رکھے کھانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے کھانے کا کہا۔ چپ چاپ دونوں نے تھوڑا تھوڑا کھایا اور تھوڑی تھوڑی چائے پی۔ سامنے سے آتے ہوئے ایک خالی رکشے پر نظر پڑتے ہی اسے رکوایا اور دونوں اس میں سوار ہو گئے۔ شکور نے رکشے والے کو اپنا پتہ بتایا۔ اسکا گھر ایک ایسی بستی میں تھا، جہاں اس شہر کے "بدمعاش" لوگ رہتے تھے۔ کچے پکے جھونپڑی نما گھر، آس پاس کچھ کیچڑ، گھر کے اندر بھی فرش پر چٹائی بچھی ہوئی، زمین پر بکھرا ہوا سامان۔ شکور نے اندر آکر لڑکی کو نیچے چٹائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

تمہارا نام کیا ہے؟" اسکے سامنے بیٹھتے ہوئے شکور نے پوچھ لیا۔ کچھ تو تعارف درکار تھا پہچان بنانے سے پہلے۔ لڑکی کی " زبان پر تالے رہے! شکور نے دو تین بار سوال دوہرایا اور جب جواب نہیں ملا تو وہ اپنی اصلی زبان میں دہاڑ اٹھا، "
"سالی، پوچھ رہا ہوں تیرا نام کیا ہے؟

دہاڑ ناکام کر گیا۔ لڑکی نے اپنی آنکھیں اوپر اٹھائی، پلکیں جھپکیں اور پھر اسکی آنکھوں کی پتلیاں رقص کرنے لگی۔ شکور کو لگا جیسے وہ ابھی کھکھلانے لگے گی۔ لیکن نہیں، اسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے اپنا ہاتھ شکور کے سامنے ''رکھ دیا، جس پر لکھا تھا، ''سلمیٰ۔

وہ اب خاموش ہو گیا۔ نام معلوم ہو گیا، اب گھر کا پتہ کیسے لگایا جائے کہ وہ کون ہے، کس کے گھر کی عزت ہے، کس کی بیٹی، کس کی بیوی، کون ہے اس کے رشتے دار؟

'' ؟ سلمیٰ تم کہاں کی رہنے والی ہو، کچھ بتاو ''

اب شکور کے لہجے میں سختی کے بجائے نرمی تھی، ایک سوز تھا۔ سلمیٰ نے پھر آنکھیں اوپر اٹھائیں اور خود فراموشی کے سے انداز سے اس طرف دیکھا۔ شکور کو لگا جیسے وہ ڈری اور سہمی ہوئی تھی۔

وہ اٹھا، ایک تکیہ لے کر اسے دیتے ہوئے وہیں لیٹ جانے کا حکم دیا۔ جیسے ہی وہ لیٹی اس نے سلمیٰ پر ایک پرانا مٹیالا سا کمبل ڈالتے ہوئے کہا، ''اب سو جاو۔'' اور خود مکان کے باہر نکل گیا۔ باہر چبوترے پر کھمبے کا سہارہ لے کر بیٹھتے ہوئے ایک بیڑی سلگانے لگا۔ موالی کی طرح زندگی گزارنے والے انسان کو کیا پتہ گرہستھی کیا ہوتی ہے، خاندان کیا ہوتا ہے، گھر کی کائنات کیا ہوتی ہے؟

وہ تو ایسی دلدل بھرے ماحول میں دنگے فسادوں کے کیچڑ بھرے تالاب میں، بیڑیاں پیتے پیتے بڑا ہوا تھا۔ اسے یہاں تک یاد نہیں کہ اسکے ماں باپ کون ہیں، ہیں بھی یا نہیں؟ اپنے ماضی سے بے خبر، اپنی اس دنیا میں مست تھا۔ آج وہ نہ جانے کیا سوچ کر یوں ہی میلے میں شوقیہ گھومنے کے ارادے سے گیا اور لوٹا تو ساتھ میں یہ حسینہ نازنین تھی۔

جب رات مزید گہری ہوئی تو اسے گھر کے اندر سے کسی خوفزدہ آواز کی دھیمی دھیمی سرگوشی سنائی دی۔ وہ سلمیٰ ہی تھی، جو صدمے سے سہمی ہوئی تھی اور نیم بیہوشی میں۔۔۔ سلیمان۔۔۔ سلیمان۔۔ کی گردان کر رہی تھی اور

پھر ''نہیں۔۔۔ نہیں'' جھنجھلاہٹ بھرے لہجے میں کہتے ہوئے اپنی چادر کو کھینچ کر منہ تک اوڑھتے ہوئے نیند کے آغوش میں چلی گئی۔

شکور نے سوچا شاید کسی ڈراؤ نے خواب کا اثر ہو یا دن کی اس واقعے کا کہیں کوئی تعلق اس سے جڑا ہو۔ ہر حقیقت سے پرے تھا شکور۔ اس نے سلمیٰ کو آواز دی، لیکن کوئی جواب نہ پا کر وہ اسے تنہائی میں آرام کرنے کے لئے چھوڑ کر پھر باہر لوٹ آیا۔ وہ رات بھر باہر چبوترے پر ٹھٹھرتا ہوا لیٹا رہا۔ صبح اٹھا تو اندر جاتے ہی اسکی آنکھیں اپنے ہی کمرے کو دیکھ کر ٹھہر سی گئیں۔ سلمیٰ کب اٹھی تھی، پتہ نہیں۔ لیکن چولہا جلا کر اس نے چائے چڑھا دی تھی، چٹائی و تکیے کو سلیقے سے سمیٹ کر لوہے کے ٹرنک پر رکھ دیا تھا۔ بکھرے ہوئے سامان کو سمیٹا کر، زمین پر پڑی ان گنت ماچس کی تیلیاں اٹھائیں اور کوڑے دان میں ڈال دیں۔ جھاڑو لگا کر، اب اپنے گھٹنوں اور ایڑیوں کے بل بیٹھ کر وہ زمین پونچھ رہی تھی۔

ارے یہ سب کیوں کر رہی ہو؟'' کہتے ہوئے شکور نے چولہے کے پاس جا کر ابلتی ہوئی چائے دو پیالیوں میں ڈالنے '' لگا۔ پھر صاف کی ہوئی زمین پر چٹائی بچھائی، ایک طشتری میں دو پیالے رکھے اور کچھ مٹھیاں رکھ کر خود چٹائی پر بیٹھ گیا۔

آو اب ہاتھ دھو کر چائے پی لو سلمیٰ'' اس نے ہاتھ ملنے کا اشارہ کیا۔ ''

سلمیٰ نے صفائی کا کپڑا کونے میں پھیلاتے ہوئے، نل کے نیچے اپنے دونوں ہاتھ مل مل کر دھوئے، لوٹ کر شکور کے پاس ہی چٹائی پر بیٹھ گئی۔ کل اور آج کے درمیانی عرصے کو ایک حادثہ مان کر سلمیٰ نے اسے اپنے اندر ہی کہیں دفنا دینے کی ٹھان لی۔ گزرے کل کو ڈراؤنا خواب مان کر بھلانے میں ہی اسکی بھلائی تھی۔ اسے چاچی کا جملہ یاد آیا۔ ''اری نادان لڑکی، اور کون! یہی تو لڑکے والے ہیں۔ اب تیرا اپنا گھر بسنے والا ہے۔ تم ہو گی، تمہارا گھر والا ہو گا، اور پھر نئ گرہستی کا آغاز ہو گا۔ یہی تو ہر ایک لڑکی کے زندگی کا ایک اہم حصہ ہوتا ہے جب وہ لڑکی سے ایک گرہ لکشمی بن جاتی ''ہے، گھر کی مالکن ہو کر اپنے گھر خاندان کو آگے بڑھاتی ہے۔

سلمیٰ کو لگا اسے اپنا من میت، شکور کے روپ میں مل گیا تھا، جو عین موقعے پر غنڈوں اور بد معاشوں سے اسکی حفاظت کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ اب شکور ہی اسکا رکھوالا تھا، وہی گھر والا بھی۔ موالی ہو گا، لیکن اس میں انسانیت جیسی خوبی بھی موجود ہے۔ اسے عورت کو عزت دینا، اسکا احترام کرنا بھی آتا تھا۔ وہی اسکا اصلی محافظ ہے، اور یہ اسکا گھر۔ وہ لڑکی سے گرہ لکشمی، گھر کی مالکن بنی اور یہی اب اسکا گھر بار ہے۔

سلمیٰ، گرم چائے پیو۔" کہتے ہوئے اس نے مٹھی کا ٹکڑا اٹھا کر اسکے منہ میں ڈالا اور چائے کا پیالی اسکی طرف ۂ آو□ " بڑھائی۔ سلمیٰ نے ایک چسکی چائے کی بھری اور پایا کہ شکور اسے پیار بھری نگاہوں سے دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے بھی مٹھی کا ٹکڑا اٹھا کر اسکے منہ میں ڈالا اور دوسری چائے کا پیالی اسکی جانب بڑھائی۔ شکور نے بڑی چاہت سے اس کے پیالی والے ہاتھ کو چھوا، سہلایا اور چائے کی پیالی کر ایک چسکی بھری۔

اس چسکی کی آواز میں جانے کیا تھا، سلمیٰ نے اپنی آنکھ اٹھا کر پلکیں جھپکیں اور پھر اسکی آنکھوں کی پتلیاں رقص کرنے لگیں۔ شکور کی آنکھوں سے دو آنسو لڑھک آئے، جو سلمیٰ نے اپنی ہتھیلی پر سمیٹ لئے۔ دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے کی آنکھوں میں اپنی کھوئی ہوئی پہچان کے عکس دیکھتی رہی۔

شکور نے سلمیٰ کو اور سلمیٰ نے شکور کو پہچان لیا۔ بس ایک ہی سچ سامنے تھا۔ سلمیٰ نے اپنی آنکھیں اٹھا کر جھپکیں، اور پھر آنکھوں کی پتلیوں کو گھماتے ہوئے کھکھلانے لگی۔ دونوں کی آنکھیں نم تھیں، ایک نئ خوشی کے ساتھ ان کی ملاقات جو ہوئی تھی۔

☆☆☆

گلشن کور

اسے میں کیانام دوں کہانی، آپ بیتی، بیتی یادیں، جگ بیتی یا الفاظ کا بنا ہوا نازک رشتوں کا ایک جال کہوں، جو حالات کے مد نظر اپنی سہولت کے حساب سے بُن لیا جاتا ہے یا ادھیڑ لیا جاتا ہے۔ جب گلشن کور سے اسکی یادوں کی چادر میں ٹانکے ہوئے ان ستاروں کی بات سنی تو سوچا خوشی غمی، جدائی ملن کے اس جذباتی سنگم کو لفظوں کی زبان دوں۔ اس کی داستان سنتے ہوئے دل میں یہی آیا، کہ جیسے رشتے ناطے، سوداگر کے سودے ہو گئے ہیں، بکاو □ یا خریدے ہوئے۔ ۂ جس کا ناطہ خریدار کے ساتھ بن جاتا ہے یا یوں کہیں بندھ جاتا ہے، کیونکہ وہ مالک ہوتا ہے اور خریدے ۂ بکاو □ ہوئے وجود کا اصلی حقدار، ہر معاملے میں اسے استعمال کرنے کا حق اسے حاصل ہوتا ہے، کام لینے کا، اپنے ارمانوں کو پورے کرنے کا، ہر طور سے استعمال کرنے کا !

اور اسی دور میں۔۔۔۔۔!

زمین کی دراڑوں کے ساتھ دلوں میں دراڑیں پڑتی رہیں، بڑھتی رہیں، چوڑی ہوتی رہیں۔ ہندو، سکھ، مسلمان، سبھی ایک دوسرے کے دشمن بن گئے، لوٹ مار کا کہرام برپا ہوا، جس میں قربان ہوتی رہی عورت کی عصمت۔ کھلے میدانوں میں بے سہارا، بے چھت لوگ بیٹھے ہوئے دیکھے جاتے۔ ایک ملک اب دو ممالک میں تقسیم ہو چکا تھا۔ سامراجی ہم آہنگی کے نام پر جیسے ایک دوسرے کو مار کاٹ کے، اپنے اپنے دل کی بھڑاس نکال رہے ہوں۔

!ایسے وقت میں۔۔۔۔۔۔

زرینہ آپا کے منہ سے سنا کہ مسلمان گھرانے کی ایک لڑکی کی شادی میں ناچ گانے میں بھنگ ڈالتے ہوئے کچھ سکھ تلواریں لے کر ٹوٹ پڑے، یہ پتہ ہی نہیں چلا کہ کس کا سر کدھر گرا، اور کس کا دھڑ کدھر۔ بس خون کے تالاب بہہ چلے۔

!ایسے میں۔۔۔۔۔۔۔

مائیں چیخیں، بلکتی رہیں اور کچھ تو اپنے بیٹوں کو دودھ کی قسم دے کر خود کو مار ڈالنے کے لئے مجبور کرتیں یا انہیں کسی کنویں میں پھینک دینے پر زور دیتیں۔ اس کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ مسلمان بھی سیخ پا تھے اور ان کو قتل کرتے ہوئے یہ نہیں جانتے تھے کہ انکے وار کے سامنے کون آیا؟ سکھ ہندو یا ان کا ہی کوئی مسلمان بھائی۔ سکھ عورتوں کو گھر سے گھسیٹ کر زیادتی کے بعد گھر کے افراد کے سامنے ہی، تمام کر دیا جاتا۔ ایسے دردناک اور دل دہلا دینے والے مناظر کو دیکھ کر کوئی کیا کرتا، کیا بولتا؟ فقط درد کو دل میں دبا کر، آج نم آنکھوں سے وہی تماشائی اپنی آپ بیتی کی دردناک ! داستان سناتے ہیں

ہاں تو گلشن بٹیا، آنکھوں دیکھے حالات کا منظر تھا، لیکن آنکھ رونا بھول گئی۔ منہ میں آواز گھٹ کر رہ گئی۔ اف کرنا"
"! قیامت بن جاتا تھا۔ دیس کی فصیلیں پھلانگنا آسان، لیکن دلوں کی بہت ہی مشکل ہو گئی تھیں ان دنوں

لیکن آپا، ایسی حالت میں آپ سرحد کے اس پار سے اِس پار کیسے آئیں؟'' گلشن کور نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو '' خوفزدہ انداز میں گھماتے ہوئے پوچھا۔

اب وہ اتنی بھی چھوٹی نہ تھی، اسے کچھ کچھ یاد آجاتا کہ وہ کس طرح ان سب حالات سے بچ بچاکر اپنی چاچی سرجیت کور اور دیگر لوگوں کے ساتھ امرتسر میں آکر بسی اور بچپن سے آج تک یہیں رچ بس گئی ہے۔ انکا کیا ہوا جو اپنوں سے بچھڑ کر پیچھے رہ گئے۔ اختصار سے پوچھنے کے باوجود زرینہ آپا کی بیان بازی نے تو کئی وارداتوں کو زندہ کر دیا تھا۔

!پھر بھی۔۔۔۔۔۔

گلشن کور متجسس تھی، یہ جاننے کے لئے کہ یہ زرینہ آپا آخر کون ہے؟ اور دو دنوں سے انکے یہاں ایسے ٹکی ہوئی ہے، جیسے کوئی نزدیکی رشتے دار ہو۔ پر یہ ممکن کسی حال میں نہ تھا۔ اسکا پہناوا، بات چیت کا لہجہ، امرتسر کے کسی بھی عام آدمی سے مماثلت نہیں کھاتا تھا۔ سرجیت چاچی نے ایک آدھ بار اڑتے اڑتے، ان کے پڑوسی ہونے کے ناطے ذکر کیا تھا۔ اور یہ بھی ٹھیک سے نہیں بتایا کہ وہ کون ہے، کس کی تعلق دار ہے؟ سبھی سوال دل کے کسی کونے میں سہمے !سہمے سے تھے۔۔۔۔۔

ایک بات جو واضح طور پر سامنے تھی، وہ تھی چاچی کے آنچل کا پیار دلار، جسے پاکر گلشن ایک کلی سے پھول کی طرح کھل اٹھی تھی۔ ایک آدھ بار لوگوں کو کہتے سنا تھا، '' گلشن کور کا حسن، کچھ الگ رنگ لئے ہوئے ہیں۔ کسی امیر گھرانے کی امیر زادی کا جلوہ ہے اسکے انداز میں، اسکی آن میں، اسکی بان میں۔'' تب وہ کچھ بھی نہیں سمجھی تھی، ان باتوں کا مفہوم۔

''ہاں تو گلشن بٹیا، تم مجھے ''آپا'' نہ کہا کرو، تم ''دادی جان'' بھی کہہ سکتی ہو۔۔''

''لیکن ایسا تو۔۔۔۔ ''

بات کو درمیان میں ہی کاٹتے ہوئے زرینہ آپا نے کہا، '' رشتوں کی بات نہیں میری لال پری! میری عمر اور ان چاندی جیسے بالوں کو دیکھتے ہوئے "دادی" کہنا، کہلوانا جائز بنتا ہے۔ اور تم بھی تو میری پوتی کی عمر کی ہو، اسی لئے کہہ رہی تھی۔"

اچھا آپا، آپ اپنی اس پوتی کو اپنے ساتھ کیوں نہیں لے آئیں؟ کیا اسے وہیں غیروں کے درمیان رہنے کے لئے چھوڑ آئیں؟ کیا نام ہے اسکا؟" پل بھر میں گلشن نے ان گنت سوال، زرینہ آپا کے سامنے دھر دیئے۔

ایسے میں۔۔۔۔!

کیا کہتی زرینہ آپا، کیا بتاتی وہ؟ کیسے اپنا سینہ چیر کر کہتی کہ۔۔! ایک ایسا سچ جو نہ اگلتے بنتا تھا، نہ نگلتے۔

آپ بتائیں نہ آپا، اسکا نام کیا ہے؟ وہ کہاں ہے؟ چاچی نے ایک دوبار آپ کا اور انکا ذکر ادھورے لفظوں میں زرینہ بانو کے نام سے کیا ہے۔ بہت یاد کرتی ہے وہ آپ کو۔" کہہ کر گلشن، زرینہ آپا کی طرف دیکھنے لگی۔

اور جیسے نیند سے جاگ اٹھی زرینہ آپا! زرینہ بانو کا ذکر سنتے ہی ہڑبڑا کر بول پڑی، "گلشن۔ اسکا نام ہے گلشن بانو، ارے۔۔۔ سارا بانو ہے!"

سارا بانو، کتنا سندر نام ہے آپا۔۔۔ کہاں ہے وہ؟" کہتے ہوئے گلشن کو رنے زرینہ آپا کی چنری کو ہلکے سے یوں لہرایا" کہ چنری سر سے اتر کر اسکی چھاتی پر آٹھہری، جو دھونکنی کی مانند چل رہی تھی۔

"وہ اب جانے کہاں کھو گئی ہے بٹیا، اسکو تلاش کرتے ہوئے میں اس دیس کو چھوڑ کر اس دیس میں آئی ہوں۔"

"کیا مطلب۔۔۔ آپا؟ آپکی سارا بانو کیا سچ میں کھو گئی ہے؟'

ہاں بٹیا، اسے ڈھونڈے ڈھونڈے میری عمر کی کمر دوہری ہو گئی ہے۔ سات سال وہاں پاکستان کی گلی گلی کی خاک '
"چھانی، پر وہ نہیں ملی۔

"سات سال سے آپ اسے ڈھونڈ رہی ہیں؟ اب وہ کتنے سال کی ہوئی ہوں گی آپا؟"

گلشن کور کے آواز میں کھلبلی سی مچی تھی۔ سوالوں کا سلسلہ بڑھتا جا رہا تھا۔

یہی کوئی پندرہ سولہ سال کی ہوئی ہو گی میری بچی، کچھ تجھ جیسی، تیری عمر کی! ماں کا آنچل چھوٹا تو میں نے گود میں "
ں گی تو کیا جواب دوں گی اسکی ماں نور بانو کو۔۔۔" کہتے ہوئے ٔ سمیٹ لیا۔ لیکن اب، جب اللہ میاں کے پاس جاو□
زرینہ بانو اپنی چھاتی پیٹنے لگی۔

....

تقسیم کے زمانے میں جھیلی گئیں، اذیت بھری یادیں، وقت بیوقت جب بھی ذہن میں کوندتی ہیں، تب وطن میں بھی بے وطنی کا احساس زندہ ہو اٹھتا ہے۔ جب خون پکارنے لگتا ہے، تب اپنے لوگ زمین کی جڑوں سے اکھڑ کر بے درد ہواؤں کے رخ کے ساتھ ہو لیتے ہیں۔ جیسے زرینہ بانو اپنی پوتی کی یادوں کی ڈوری تھامے، اچانک امرتسر آن پہنچی، بغیر کسی اطلاع کے۔۔۔! سرجیت کور اسے دیکھ کر زرد پتے کی طرح سہم گئی، جیسے بہار میں خزاں کی کوئی آہٹ سن لی ہو۔ آنکھوں سے نیند ندارد سی ہو گئی۔ ایک نامعلوم ڈر اسکے دل کے کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ وہ زرینہ بانو سے آنکھیں چرانے لگی، اس سے کترانے لگی۔ اکثر سامنانہ ہو اس لئے زیادہ وقت گردوارے میں گزارتی۔ گھر میں رہ جاتے دو افراد، زرینہ بانو اور گلشن۔

اس بات کا احساس زرینہ بانو کو بھی ہوا۔

....

تبھی چرمراہٹ کی آواز سے دروازہ آنگن کے اندر کھلا اور سرجیت کور گردوارے کی سیوا سے نجات پاکر گھر لوٹی۔ گلشن کور، چاچی کو دیکھ کر اٹھی اور اسکے ہاتھ سے لنگر سے لائے ہوئے پرساد کے "دونے" اور کھانے کا سامان لے کر رسوئی میں جاتے جاتے کہنے لگی۔

چاچی کھانا پروس دوں، آپا بھی صبح سے بھوکی بیٹھی ہیں، صرف چائے پر ٹکی ہوئی ہے اور اپنی کھوئی ہوئی پوتی سارا بانو "
"کے درد کی داستان بتا بتا کر بے سدھ ہوئے جارہی ہیں۔

ہاں گلشن' بیٹی، دو طشتریوں میں پرساد بانٹ کر تم دونوں کھالو۔ میں وہی کھا کر آئی ہوں۔" کہہ کر سرجیت کور، ' وہیں کھٹیا پر کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹنے لگی۔

گلشن نے کھانا پروس کر لانے سے پہلے ایک ہلکی سی رضائی چاچی کے تھکے بدن پر پھیلا دی۔ چاچی کا دل اسے دعائیں دیتا !ہوا نیند کی آغوش میں جانے لگا۔ دوپہر کے دو تین بج رہے تھے، نیند تو آنی ہی تھی۔۔۔۔

لیکن ایسا چاہ کر بھی نہ ہوا۔ سرجیت کور نے آنکھیں تو بند کر لیں، لیکن بند آنکھوں میں جو سائے تیر آئے، ان سے اسکا بدن تھرا اٹھا تھا۔ یہ تو بھلا ہو گلشن کا جو اس پر رضائی کی تہہ چڑھا گئی، لیکن یادوں کے نکیلے بھیدی، جو آنکھوں کی نیند چگ رہے تھے، انہیں کون سمجھائے! ماضی کے سائے صدا بن کر کانوں میں گونجنے لگے۔ سات آٹھ سال پرانے عکس، سندھ سے ہند میں آنے کی تیاری والے ماحول کو پھر سے زندہ کرنے لگے۔

....

ارے سرجیت بہن، ہم سالوں سے پڑوسی بن کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے مائی باپ ہی ہیں۔ بس اب نگوڑے "
"وقت نے فاصلے بڑھا کر ہمیں پچھاڑنے کی ٹھان لی ہے۔

ہاں زرینہ بیگم یہ تو ہے۔ اب کے بچھڑے تو جانے پھر کب ملیں گے، ملیں گے بھی یا نہیں، کون جانے؟ سردار نے تو" کل صبح سویرے ہی نکلنے کی ٹھانی ہے۔ پاکستان کی بارڈر پھلانگ کر بھارت بس جانے کی بات بنی ہے۔ صبح ہم دونوں ہی "نکل جائینگے۔ تم سے بھی شاید ہی مل سکیں، اسے ہی آخری ملاقات سمجھنا۔

اتنا کہہ کر سرجیت، زرینہ بیگم کے گلے لگ کر اپنے آنسو قمیض سے خشک کرنے لگی۔

نہیں نہیں سرجیت، یوں نہ کہو، ہمیں ملنا ہے، بچھڑنا نہیں۔ تمھیں میری ایک امانت اپنے ساتھ لئے جانی ہے۔ اس " "وقت میرا یہاں سے ہلنا محال ہے۔

سرتاج کی باندی جو ہوں۔ اپنی مرضی سے جا نہیں سکتی، لیکن میری گلشن بانو کو تو تو اپنی بنا کر ساتھ لے جا سکتی ہے۔" اسکی تو ماں نہیں ہے، اب تو ہی اسکی ماں بن جا اور میرے جگر کے ٹکڑے کو اپنے گھر آنگن میں جا کر روپ دینا۔ اگر "زندگی نے وقت اور موقع دیا تو ضرور ملیں گے۔ اب چلتی ہوں۔

"پر زرینہ بیگم۔۔۔ میں ہندو۔۔ تو۔۔۔ "

ارے بس بھی کر، کہا نہ وہ تیری ہے۔ تو جو چاہے اسکا کر۔ اپنا نام دے یا نیا نام کرن کر، اسے اپنے ساتھ لے جایا " یہاں مرنے کے لئے چھوڑ جا، یہ تیری مرضی ہے، میری نہیں۔۔۔" کہتے ہوئے زرینہ بانو، ہوا کی رفتار سے گھر سے باہر نکل گئی۔

اور پلک جھپکتے رہ گئی سرجیت کور اپنے ہی گھر میں، ویران دیواروں کے درمیان، تھر تھراہٹ محسوس کرتے ہوئے، ایک لرزش بھرا احساس محسوس کرتے ہوئے۔ وہ بے اولاد تھی، لیکن سینے میں ممتا نہیں تھی، ایسی بات نہیں تھی۔ بس ڈر تھا کہ ذات پات کی دیواریں کہیں اس رشتے کو اونچ نیچ کے ترازو میں نہ تول بیٹھیں۔ مذہب کی قربان گاہ پر !گلشن بانو کے معصوم بچپن کو کہیں کوئی آنچ نہ آجائے۔ ماحول ہی ایسا تھا کہ۔۔۔۔۔

سکھ اور مسلمان اک دوسرے کے کٹر دشمن ہو گئے تھے۔ بات بات پر تلواریں چمکتیں اور درد، چپ سادھے، سسکتا رہتا ان سنے ہوئے خون کے دھبوں کو دیکھ کر، جو ایک ہی رنگ کے تھے۔ سرخ! سبھی کا خون لال ہے تو کیوں کسی کے درد سے خون میں ابال نہیں آتا؟ کیوں درد کو دیمک لگی ہے کہ دیکھ کر بھی کسی کا دل نہیں پسیجتا؟ کیوں انسانیت اپنے آپ کو یتیموں کی جانب دھکیل رہی ہے۔

....

کھاٹ پر لیٹی سجیت جانتی تھی کہ رضائی تو صرف بدن کو ڈھانپ رہی تھی، اسکا دل تو کل کے فسادات کی نکیلی یادوں سے تار تار ہوا جا رہا تھا۔۔۔۔!

"اری سرجیت کور، تو کیوں سوئی ہے؟ دن کی روشنی کو رات کی کالک سمجھ بیٹھی ہے کیا؟ اٹھ، تیرے آنگن میں اجالا اب بھی باقی ہے۔ ساری کی ساری تاریکیاں میں نے اپنے آنچل میں سمیٹ لی ہیں!" کہتے ہوئے اس نے درد بھری آواز میں گلشن کور کی جانب دیکھتے ہوئے ایک حکم دیا۔

" ارے بیٹا گلشن، تین طشتریوں میں کھانا بانٹ لینا۔ تیری امی سرجیت بھی ہمارے ساتھ کھائے گی۔ آج کا دن ملن کا جشن ہے، دھرتی آسمان سے مل رہی ہے! ہاں۔۔۔، آ جا تو بھی آ جا۔ سرجیت تو بھی اٹھ۔"

اب گلشن کور سوچ کے دریا میں بہنے لگی۔ وہ حیرانی سے زرینہ آپا کے کہے گئے الفاظ سے، کسی ادھیڑ بن میں الجھ گئی، جس میں پیار بھی تھا، دلار بھی، درد بھی اور دوا بھی! سرجیت کور سے بھی نہ سہا گیا نہ رہا گیا، اٹھ کر کھاٹ پر بیٹھی اور بھی نم پلکیں اٹھا کر زرینہ بانو کی طرف دیکھنے لگی۔ گہرائی تک اسکی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے یہ جاننے کی کوشش کرنے لگی تھی کہ زرینہ بانو کیا واقعی ملن کا جشن منانے کی بات کر رہی ہے یا اسکے بعد کی جدائی کا اعلان کر رہی ہے؟ زمین آسمان کے ملن کی بات وہ چاہ کر بھی سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔

!کیونکہ۔۔۔۔۔۔

زرینہ بانو کی پوتی گلشن بانو کو جب دونوں میاں بیوی اپنے ساتھ امر تسر لے آئے تو سردار نے سبھی سے کہا کہ وہ انکے بھائی کی بیٹی ہے، گلشن کور۔ کیونکہ سبھی جانتے تھے کہ انکی کوئی اولاد نہیں ہوئی اور پھر گردوارے میں نام کرن کے اعلان سے انکے سونے بنجر سینے میں جیسے شبنم کی نمی برسنے لگی۔ ممتا کا آنگن پھلنے پھولنے لگا، گلشن کو سینچتے سینچتے اس خوشبودار پھول کی مہک انکے دلوں میں رچ بس گئی۔

میں آپ کو امی کہہ کر پکاروں گی اور انہیں بابا کہہ کر۔ یہ چاچی کہنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔" گلشن کور نے ضد کی۔ عمر بھی" تو ایسی تھی، سات آٹھ سال کی۔

۔" ز نہیں تم مجھے چاچی ہی کہو گی۔ تمہاری آواز میں مجھے چاچی کہنا، امی جیسا ہی لگتا ہے۔ سردار کو بھلے تم بابا بلاو □" سرجیت نے دلیل دے کر اپنے طریقے سے گلشن کو منا لیا۔ اس کا ایک سبب تھا، جو دل میں ڈر بن کر سما گیا تھا۔

!ڈر یہی تھا۔۔۔۔۔۔

کبھی نہ کبھی تو حالات بدلیں گے، وقت بدلے گا اور خون اپنا رنگ دکھائے گا۔ اگر ایسا ہوا تو گلشن پھر سے زرینہ بانو کے گھر کا گلشن بنی، تو وہ یقیناً خزاں کے سوکھے پتوں کی طرح چرمرا جائے گی۔

اور پھر موسموں کا روپ دھار کر دن، مہینے سال گذرنے لگے۔ تین سال کے بعد گلشن کے بابا پر لوک پدھارے اور سرجیت نے گلشن کی سسکیوں کو سینے میں سنجویا، اسے دوگنا پیار دلار دیکر وہ گرو کی شرن میں آن بسی۔ گردوارے کو دوسرا گھر بنا لیا۔ دن رات دن کی سیوا اسکی آرادھنا بن گئی۔ یہ دیکھ کر پنچوں نے گردوارے میں ہی اسے ایک کمرہ دے دیا، جہاں دونوں ماں بیٹی مناسب رہن سہن اور حفاظت کے ساتھ زندگی گزارنے لگیں۔ زندگی کی دھوپ

چھاؤں کے سائے دار لمحات کے درمیان، گلشن بھی اب بچپن سے جوانی کے چوکھٹ پر آکھڑی ہوئی۔ سولہ سال کی ہوتے ہی کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔

!اور ایک دن اچانک۔۔۔۔۔۔

زرینہ بانو کا خط سرجیت کور کے نام گردوارے کے پتے پر ملا، جس کے مطابق، وہ اس سے ملنے کچھ سکھوں کے ساتھ ں کی مہک کسی سرحد کی محتاج نہ تھی۔ اور اکثر اسکی شہرت ہٖ اسی گردوارے میں آرہی ہے۔ سرجیت کی سیوا او□ امرتسر کے اس گردوارے کے ساتھ منسلک رہتی۔ زرینہ بانو کا دل گواہی دیتا رہا کہ یہی اسکی گلشن بانو کی ماں ہے۔

....

ماضی کے گلیاروں سے ہوتی ہوئی سرجیت کور کی یادوں کی پرچھائیاں، اسے حال میں لے آئیں۔ زرینہ بانو کی آواز ایک خوشنما خبر کی طرح ہوا کی ترنگ بن کر لہرا رہی تھی۔ وہ اٹھ کر کھاٹ پر بیٹھی اور زرینہ بانو کی جانب بھیگی پلکوں سے دیکھتی رہی۔

زرینہ بانو نے ایک شوخ مسکراہٹ کے ساتھ کھانے کی طرف اشارہ کیا تو سرجیت کو جیسے ہوش آیا۔

گلشن بیٹی روٹی تو لے آئی ہو، لیکن دال اندر ہی بھول گئیں۔ کیا اپنی آپا کو روکھی روٹی پروس دو گی؟" کہتے ہوئے " سرجیت کور اپنی کھاٹ سے اٹھ کر زرینہ کے برابر بیٹھ گئی۔

اری دئیا۔۔۔" کہتے ہوئے گلشن کور، رسوئی گھر کی طرف بھاگی۔ "

سرجیت اب چلو، اب نوالے ادلا بدلی کرو اور جشن مبارک کو انجام دو۔" کہتے ہوئے زرینہ بانو نے پہلا نوالہ گلشن " کور کے منہ میں ڈال دیا اور دوسرا سرجیت کور کے منہ میں۔ سرجیت کور اور گلشن نے بھی وہی رسم نبھائی۔ اس خوشی کے سامنے درد کی لمبی چوڑی فصیلیں بونی ہو گئیں!

سبھی کے چہروں پر مدھر مسکان دکھنے لگی۔

"اری سرجیت ایک بات تو بتا، جتنا سندر نام گلشن کور تونے اسکا رکھا ہے، اسکے سامنے تو اسکا حسن بھی پھیکا پڑ رہا ہے۔"

ہاں زرینہ بیگم، اس پار کے گلشن کا رنگ، اس پار کی گلشن کے حسن کے سامنے پھیکا ہی پڑ تا ہے۔ اس پار کے اس گلشن" کی خوشبو میری سانسوں میں کچھ یوں بسی ہے کہ اب لگتا ہے کہ اسکے بنا بھی کیا کوئی زندگی ہو گی ؟" اور وہ اپنی کہی ہوئی بات کا رنگ زرینہ بانو کی آنکھوں میں دیکھنا چاہ رہی تھی۔

خوش نصیب ہو سرجیت کور، اس کی پرورش میں تم نے اپنے واہ گرو کی کل کل بہتی گربانی بھی گھول دی ہے۔ ہاں " گلشن کور سچ میں تیرے آنگن کا پھول ہے، جو ہر مذہب سے پرے، سچ کی پناہ میں پنپ رہا ہے۔" کہہ کر زرینہ آپا نے گلشن کور کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

زرینہ بانو۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔" سرجیت روہانسی ہو گئی "

ارے جشن مبارک کے بعد ایسے آنسو نہیں بہاتے پگلی۔ یہی واہ گرو تمہارا مالک ہے۔ میں اگلے ہفتے "سرتاج" کی پناہ" ں گی۔ تم گلشن کور کے ساتھ، خوش رہو، آباد رہو۔ ' ' زرینہ بانو نے سرجیت کو گلے لگا لیا۔ ; میں چلی جاو □

دادی جان۔۔۔ آپ کچھ دن اور رک جائیں ہمارے پاس۔" گلشن کور کے اس کومل جملے نے زرینہ بانو کو گدگدا دیا۔" اس جملے میں رشتوں کی مہک تھی، اور اپنائیت کا احساس تھا، جسے وہ جینا چاہتی تھی، سنجونا چاہتی تھی

☆☆☆

پلکوں پر خواب

دھند گھنی ہوتی جارہی ہے، ساتھ ساتھ میرے بوجھل قدم بھی بھاری ہوتے جارہے ہیں۔ سفر طویل اور راستہ میرا منتخب کردہ ہے۔ میں سفر کی تنہا اور اکلوتی مسافر اور اس کہانی کے فقط کردار کے ساتھ ہم سفر ہوں۔ سفر مسلسل جاری ہے، طویل سفر میں اگر کہیں پڑاؤ آجائے تو اسے منزل قطعی طور نہیں مانا جاسکتا؟ خود غرضی سے بھرے شہروں میں، جن کی خود سے بھی کبھی شناسائی نہیں ہوئی، وہی سمجھدار خود کو جانے کیا سمجھ کر اتراتے پھرتے ہیں۔ دوغلی سوچ، دوہری زندگی، مخالف سمتیں، ایسی حالت میں ملن کیسے ممکن ہو۔ ناممکن کو ممکنات مان کر چلنا، اسے تو دل کی شرارت یا جی کا بہلاوہ ہی کہا جاسکتا ہے؟

پر قصور کس کا؟ دل بھی تو اپنا ہی ہے، کسی اور کا نہیں، جو کسی پرائے کو اپنا مان لے۔ اپنا بھی کیسا؟ میت جیسا، جو دل کے قریب، خیالوں میں بس سا گیا۔ ہاں میت ہی تو تھا وہ! نام سے، پہچان سے، ایسے ہی جانا تھا اسے۔ بس ایک دن ہجوم میں

مل گیا، جیسے مل کر بھی نہ ملا ہو۔ اسکے بعد آج تک میں اسی ہجوم میں تنہا تنہا، ہر راہ کے، ہر موڑ پر، اسے ڈھونڈتی رہتی ہوں۔ حقائق سے واقف ہو کر بھی ناواقف، پرچھائیوں سے خود کو بہلاتی رہتی ہوں۔

ماضی کی ہی بات ہے اور اب بھی ماضی میں ہی جی رہی ہوں۔ میں اپنے وجود کے ساتھ گھر کی چار دیواری میں ارتکاز بھری زندگی بسر کیا کرتی تھی۔

ارے میں بھی کہاں بہاؤ میں بہے جا رہی ہوں، بس اب بھی کر رہی ہوں اور یہ سلسلہ چلتا رہے گا، جب تک جان میں جان ہے۔ یاد آیا، وہ کہا کرتا تھا "میری جان ہو، میرا ایمان ہو۔" اور اس پاگل پن میں، دل نے نہ جانے کیا محسوس کیا، جو اپنی جان، اپنا ایمان مان کر سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ سودے بازی کی اس نگری میں لین دین لازمی ہے، دل دو، دل لو، دل دو، درد لو۔ پھر تا عمر دوا کی تلاش میں بھٹکتے رہو، جیسے ایک نئ کھوج کی نئ شروعات۔۔۔۔ !

یہ آرزو ٹھوکر لگنے سے پہلے نہیں رہتی۔ شاید پتہ ہی نہیں رہتا کہ پانا کیا ہے، کھونا کیا ہے؟ ہاں یہ بات اور ہے کہ چاند کو پانے کی تمنا میں لوگ اپنے اندر کے اجالوں کے دیپ بجھاتے رہتے ہیں اور یادوں کے جھلملاتے جگنو جلائے رکھتے ہیں۔ دل کی دہلیز پر ہر آہٹ، آہ سی بن جاتی ہے، ایک تڑپتی جلن کا احساس، ایک تشنگی کا جنون، جو سوچ کے دشت میں سرابوں کے درمیان رہ کر، ایک ان بجھی پیاس کو ساتھ لئے چلتا ہے، سلگتا ہے، دھڑکتا ہے، تڑپتا ہے۔

اسی بھیڑ کے قافلے میں میت سے ملنا ہوا۔ پہلی بار آنکھ نے دیکھا، دھڑکن تیز ہوئی، ایک رشتہ قائم ہوا۔ اور وہی جب پیار میں تبدیل ہوا تو دل کی گہرائیوں میں بس گیا۔ سچ مانو، وہ بھی کرائے کے مکان کو اپنا سمجھ کر بستا گیا، یادوں میں آباد ہوتا رہا۔ اسکے ساتھ میں جو کچھ ملا، وہ سودا نفع کا تھا یا گھاٹے، کا کہنا مشکل ہے۔ ہوا کا رخ، بے رخی سے بدلا ہے، پیٹھ دے کر چلنا تو کسی بھی حالت میں ممکن نہیں۔ جو درد ملا، وہی دل میں سما نہ سکا، عرصے کے بعد وہ نا قابل برداشت ہوا اور اب رسوائیوں کی تپش سے پگھلتا ہوا بہہ رہا ہے، رس رہا ہے۔ امید کے دیپ جہاں جلتے ہیں، انکے بجھنے پر مایوسی کے اندھیرے کو اوڑھنے کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہتا۔

امید و ناامیدی کے درمیان جھولتی ہوئی، ہیں اسی امید کی بات ہو رہی ہے، ہاں جس کردار کو لے کر یہ قلم چل رہا ہے۔ اسی کا نام "آشا" ہے، جو میت سے ہجوم میں ملی، اسکی امید بن کر، اسکی زندگی بن کر۔ اگر امید زندگی ہے تو پھر مایوسی موت ہی ہونی ہے۔ انہیں خیالوں میں سمٹی آشا، اپنی نامعلوم ڈگر پر، اس طویل اور تنہائی بھرے سفر کے دوران، آگ کا یہ دریا پار کرنا چاہتی ہے۔

لیکن اب کیا؟ اب تو دیر ہو چکی ہے، آگ لگی ہے، گھر جلا ہے، وجود بکھرا ہوا ہے۔ سمیٹنا ہے سب کچھ، لیکن کہاں سے شروع کیا جائے؟ انہیں الجھے الجھے سوالوں کے ساتھ سفر جاری ہے آشا کا، اور جواب میں مایوسی منہ چڑانے کے سوا کچھ نہیں کر پا رہی ہے۔

....

"نہیں میں ایسا کچھ نہیں کر سکتی میت، تم سمجھ کیوں نہیں رہے ہو؟ میرے اس ایک غلط قدم سے زندگی بکھر سکتی ہے، میں ٹوٹ سکتی ہوں۔"

"ارے ایسا کچھ نہیں ہو گا، بھروسہ رکھو مجھ پر، خود پر اور قسمت پر۔ میرا سچ تمہارے سامنے ہے اور سچ کو آئینے کی ضرورت نہیں ہوتی آشا۔"

"میت میں تمہاری ہونا چاہتی ہوں، زندگی ساتھ گزارنا چاہتی ہوں، تمہاری امیدوں پر پورا اترنا چاہتی ہوں۔"

کہیں دور سے کچھ سنائی دے رہا ہے۔

تم امید آس ہمارے

تم دھرتی آکاش ہمارے

زندگی بھی کیا غضب ڈھاتی ہے، کبھی ہنسا کر رلاتی ہے، کبھی شدید دھوپ میں شبنمی احساس بن کر سہلاتی ہے۔ اور یہ پاگل دل، پرچھائیں کو حقیقت سمجھنے کی، ماننے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ قدم آگے بڑھ رہے ہیں۔۔۔ خیالوں کی گھنی دھند کی جانب۔۔۔!

"تو پھر چلو میرے ساتھ، تھام لو میرا ہاتھ۔ میں اور تم اب الگ نہیں، ایک ہیں۔"

"میت چلو، ہم شادی کر لیتے ہے، ان رسموں کے قسمیں کھا کر زندگی کا آغاز کرتے ہے۔"

"آشا، کیا پیار کسی ضمانت کا، کسی ثبوت کا، محتاج ہے۔ یہ رسومات، سماجی روابط ہیں، جو پیار کرنے والوں کے پیروں کو زنجیریں بن کر جکڑتی ہیں، ان سے آزادی چھین لیتی ہیں۔ میں نے تم سے پیار کیا ہے، تم بداعتمادی جتا کر !۔۔۔۔۔۔۔"

"نہیں، نہیں میت۔۔۔۔۔ مجھے تم پر، تمہارے پیار پر پورا بھروسہ ہے۔۔۔۔۔! میں صرف۔۔۔" آشا جیسے یقین اور بے یقینی کے بھنور میں ڈول رہی تھی۔ تذبذب اسکی فطرت میں تھا شاید، تبھی تو زندگی کا فیصلہ لینے میں مشکل کا شکار تھی۔ اب اس حالت میں نہ کچھ کہہ پائی، نہ کچھ کر پائی۔ بس اپنے گھر کی دہلیز کے اندر کھڑی رہی اور وہ ہاتھ بڑھا کر آواز دیتا ہوا دہلیز کے باہر کھڑا رہا۔

"تو پھر چلو چلیں وہاں، جہاں پیار کے رشتے میں صرف بھروسہ ہو، لگن ہو۔ وہاں، جہاں اپنی ہستی مٹا کر، ابدی محبت کے جام پینے کے بعد کوئی سراب باقی نہ رہے۔" کہتے ہوئے میت نے اسکا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی۔ اور ہاتھ سے ہاتھ کا رابطہ ہوا۔۔۔۔ دل کو مدہوش کرتی کشش کے تحت دونوں، ایک دوسرے کے قریب اور قریب آتے رہے۔۔۔ مدغم ہوتے رہے۔۔۔۔ پھر اچانک، آشا کی سانسوں کی رفتار تیز ہوتی رہی۔۔۔۔۔ پھر دھیرے

دھیرے نارمل ہوئی۔ اسے یقین ہی نہیں ہوا کہ وہ اپنے گھر کی دہلیز کے پار کھڑی ہے، کئی قدموں کے فاصلے پر۔ اور سامنے ہے میت، جو اسے شرابور کرنے پر آمادہ ہے۔

چلیں آشا!" کہہ کر میت نے اسکا ہاتھ تھامنا چاہا۔ لیکن یہ کیا؟ اسکے ہاتھ سے آشا کے ہاتھ کی انگلیاں یوں پھسلتی" رہی، جیسے مٹھی سے ریشمی ریت۔

چلتی ہوں۔۔۔" یہ آشا کی دھیمی، مدھم آواز، میت کے کانوں سے ٹکرائی۔ سرور کی مدھم بے خودی سے جب" اسے ہوش آیا تو دیکھا، آشا گھر کی دہلیز کے اس پار قدم رکھتے ہوئے اپنے گھر آنگن کے تحفظ میں آگے بڑھ رہی تھی۔ اور وہ ساکت سا، ہارا ہوا سا، اسکی جانب پلکیں جھپکائے بغیر دیکھتا جارہا تھا، اس آشا کو، جس کا چہرہ وہ ابھی تک نہیں دیکھ پایا تھا۔ ایک خواب جو آنکھوں میں تراشا تھا، وہی مایوسی کی پلکوں پر ٹوٹ کر بکھرتا رہا۔

عورت کے لئے گھر کی چار دیواری، اسکی عزت و ناموس کا نشان ہوتی ہے۔ گھر کی چوکھٹ کے باہر ہزار دیئے جلانے سے بھی گھر روشن نہیں ہوتا۔ یہ سمجھنے میں نے آشا نے جتنی تاخیر کی، سنبھلنے میں اتنی ہی جلدی۔

ساڑی کا آنچل ہوا میں پھڑ پھڑاتا ہوا، لہرارہا تھا، جیسے اپنی آزادی کا جشن منا رہا ہو۔ کیا کوئی ہوا کو قید کر پایا ہے؟ وہ تو سب کی ضرورت ہے۔ ہاں وہی امید، ایک ہوا کا جھونکا !

☆☆☆

دیوار ہل گئی

گھنٹی پھر بجی۔ سوچا اٹھ کر دروازہ کھولوں، لیکن بدن کی نقاہت آڑے آئی۔ اٹھنے کی ناکام کوشش کی، پھر لیٹ گئی۔ تین دن سے بخار کچھ یوں چڑھا ہے کہ اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ گھر کے جتنے دوا دارو کے نسخے تھے، بدل بدل کر آزمائے، تاہم کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ سبھی بیکار ثابت ہوئے۔ منہ کا ذائقہ تک بدل گیا ہے۔ دن میں دو بار چائے میں ڈبل روٹی ڈبو کر کھاتی اور پھر دوا لے لیتی۔ تکلیف سے بدن بے جان سا ہوا جا رہا ہے۔ سوچ میں ہوں کہ کتنے دن اس طرح پڑی رہوں گی۔ دفتر میں پیغام بھیج دیا ہے۔ لیکن تین دن بہت ہوتے ہیں۔ نئی نوکری پر نہ جانے کے یہ بہانے زیادہ دن نہیں چلتے۔ جب نوکری ہی عارضی ہو، تو عین وقت پر وہ اسے نکال کر کسی اور کو رکھ سکتے ہیں، جیسے مجھے کسی کی جگہ کی بھرپائی کے لئے رکھا۔ میں بھی اس تکلف کو پورا کرنے کے لئے تین مہینے سے ان کی ملازم ہوں۔

پہلے پندرہ دن، نیاکام سیکھتے ہوئے سکون سے گزر گئے، لیکن اب یہ ستم ظریفی سامنے آئی ہے۔ایک تپتی دوپہر، جیسے "ہی میں گھر پہنچی، تار ملا۔ لکھا تھا، "چار دن پہلے رام گزر گئے، وضعداری نبھانے اگر آنا چاہیں تو بیشک آ جائیں۔ ابھنو عجیب ستم ظریفی تھی۔ جیتے جی تو دل میں ایک آس تھی کہ رام ہے تو میں ہوں، پھر چاہے میں ان سے کتنی ہی دور ں؟ انکے جیتے جی ناطہ ٹوٹا تھا، اب وہ ہر بندھن توڑ کر مجھے آزاد کر ہٰ کیوں نہ رہوں۔ اب کس رشتے سے اس گھر جاو □ !گئے۔ پرانے مناسب، نامناسب رشتوں کی ہر بندش سے آزادی دلا کر۔۔۔

نجات پانے کی خواہش تب ہوتی ہے، جب بندھن کا شکنجہ کسنے لگے۔ مگر وہ حالت تو چار سال پہلے ہی نجات کا ذریعہ بن گئی، جب میں نے اپنی مرضی سے گھر سے دست برداری کی۔ ایک چار دیواری سے نکل کر دوسری میں پناہ پائی۔ جب رشتوں کے درمیان، غیر اعتمادی کی دیوار آ جائے، تب قریب ہونے، نہ ہونے کا کوئی مطلب باقی نہیں رہتا۔ نظارہ، چھلاوہ بن جاتا ہے۔ میں نے اپنی خواہش سے گھر کو چھوڑ دیا، رشتوں کی بیڑیاں توڑ ڈالیں۔

....

اس گاؤں میں جہاں میں شادی کر کے رام بجاج کی شریک حیات بن کر آئی، وہاں رشتوں میں سچائی تھی، سادگی اور پیار تھا۔ دکھاوا نام برابر نہیں تھا۔ کچے گھر تھے، لیکن اپنائیت کے پختہ ناطے تھے۔ سبھی کے دل خوشیوں کی دولت سے مالامال تھے۔ ایسے میں چوٹ ایک انسان کو لگتی، درد دوسرے کو ہوتا۔ ہر ایک کا دکھ درد دوسرے کو اپنا لگتا۔ سب ایک دوسرے کے ساتھی، سبھی ایک خاندان کے افراد، ایک چھت کے تلے گزر بسر کرتے۔ میں نے خود کو بہت خوش نصیب سمجھا اور مکمل طور سے خود کو اس گھر، گھر کے لوگوں کے درمیان گھل مل کر رہنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ رام اور اسکے خاندان کے دیگر افراد کے کام کے بوجھ کو اپنے جوان کندھوں پر ڈھونے لگی، جو ان سبھی کو بہت راس آیا۔

شادی کے بعد چھ، آٹھ مہینے یوں گزرے جیسے آٹھ دن۔ میری ساس بھی مجھے اپنی بیٹی کی طرح بے پناہ پیار اور شفقت کرتیں۔ میری کسی بھی غلطی پر کبھی ناراض نہیں ہوتیں، بلکہ ہمیشہ پیار اور خلوص سے سمجھاتیں۔ سسر کئی سال پہلے پربھو کو پیارے ہو گئے تھے۔ رام کے بڑے بھائی امر بجاج اور انکی بیوی شکنتلا، اپنے دو بچوں کے ساتھ قریب ہی واقع، ایک کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ خاندان کے سبھی افرادرات کو کھانے کے بعد ایک گھر کے صحن میں ملتے، کھل کر بات چیت کرتے، صلاح مشورہ کرتے اور ایک دوسرے کے مشورے کے مطابق مل جل کر ہر فیصلہ لیتے۔ کوئی بھی بات کسی سے پوشیدہ نہیں رہتی، اسی بات نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔

رام کی بڑی بہن میرا، پڑوس کے گاؤں میں بیاہی گئی تھی، عمر میں رام سے بیس سال بڑی تھی۔ میری شادی پر اپنے دونوں بچوں، ابھنو اور آرادھنا کو ساتھ لے آئی، تبھی ان سے ملنا ہوا تھا۔

بیس سال کا ابھنو بڑا اگبرو، سگھڑ نوجوان تھا۔ چہرے پر ہمیشہ غضب کی کشش اور آنکھوں میں ایک سلونی لبھاؤنی مسکراہٹ لئے رہتا۔ اسکی بہن آرادھنا، پندرہ سال کی تھی اور ہو بہو ماں پر گئی تھی۔ سننے میں آیا کہ جب اٹھارہ سال کی عمر میں میرا کی شادی ہوئی تھی، تب وہ اس جیسی ہی لگتی تھی۔ اب کچھ موٹی اور بے ڈول سی ہو گئی تھی۔ یہ ہے ہماری چھوٹی سی گھریلو کائنات کے ملنسار افراد جو اپنائیت کا مفہوم اچھی طرح جانتے تھے۔

شادی کے کئی سال بعد میرا کو کینسر کی نگوڑی بیماری نے گھیر لیا۔ بہت بھاگ دوڑ کر کے اس نے آرادھنا کے ہاتھ پیلے کر دیئے۔ لڑکی جا کر اپنے سسرال میں بس گئی، یہی سوچ کر میرا مطمئن سی ہو گئی۔ باقی رہا ابھنو۔ میرا کو پتہ تھا، وہ بچنے والی نہیں، اسی لئے اپنی ماں اور بھائی بھابھیوں کو اسکی ذمے داری کے لئے گزارش کرتے ہوئے، ابھنو کا ہاتھ انکے ہاتھ میں سپرد کر دیا۔ کچھ دن زندگی کے مزید گزار کر، وہ دنیا کو الوداع کہہ گئی۔ چند مہینوں کے بعد ساس بھی بیٹی کے غم میں چل بسی۔

امر اور شکنتلا نے اپنے دو بچوں کا بہانہ کر کے، ابھنو کو ہمارے ساتھ رہنے کا فیصلہ سنایا۔ ہم نے بھی اپنے ہونے کی عزت کا مان رکھتے ہوئے، اس ذمے داری کو قبول کر لیا اور بغیر کسی کھینچا تانی، خوشی خوشی ہم اپنے اپنے گھروں میں رہنے لگے۔ وقت آرام و سکون سے کٹ رہا تھا۔ گھر بار، کاروبار سب کچھ۔ رات کو کام سے لوٹنے پر رام، ابھنو اور میں ساتھ کھانا کھاتے۔ پورے دن کی خبریں ایک دوسرے کو دیتے، ہنسی خوشی اپنے سپنوں کو ساتھ لے کر سو جاتے۔ ہمارے دو کمرے تھے۔ ایک اندر والا کمرہ اور دوسری بیٹھک جیسی اوطاق۔ ابھنو کو اوطاق میں ہی سونا پڑتا تھا۔

ایک رات ایسی آئی، جو میرے زندگی کی اماوس ساتھ لے آئی۔ رات کو ڈیڑھ بجے، ابھنو نے آہستہ سے آ کر مجھے جگایا۔ "ممانی میرے سر میں بے حد درد ہے، ایسے جیسے سر پھٹ رہا ہے۔ کچھ دوا دیجیے یا میرا سر دبا دیں۔

میں جلدی سے اٹھ کر اوطاق میں آئی، سر درد کی گولی اسے دی اور بام لے کر اسکی کھٹیا پر بیٹھ کر اسکے ماتھے کو دبانے لگی۔ اسی وقت رام اندر چلا آیا اور میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ایک رات کا وقت، دوسرا سناٹے کا ماحول۔ رام کو دیکھ کر میں خود بھی گھبرا گئی۔ حقیقت بتا کر میں اٹھ کھڑی ہوئی اور کمرے کی طرف جانے لگی تو رام کی آواز نے پیر باندھ لئے۔

تم وہی کرو جو کر رہی تھی۔ بعد میں آ جانا۔" رام کے آواز اور رویے میں ناراضگی کے ساتھ بیگانگی کی جھلک بھی" نمایاں تھی۔ میں یہ سوچ کر پریشان ہو گئی تھی، کہ رام آج کل کی نئی روشنی کا پڑھا لکھا انسان ہو کر اتنا تنگ دل اور شقی کیسے ہو سکتا ہے؟ ابھنو بھی اپنے جگہ پشیمان رہا، یہی سوچ کر خاموش رہا کہ کچھ کہنے پر بات کا بتنگڑ نہ بن جائے۔ شاید کچھ دنوں میں بات رفع دفع ہو جائے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جیسے جیسے دن گزرتے گئے، مجھے محسوس ہونے لگا کہ شک کا پارہ سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ مجھے گھبراہٹ کے ساتھ بے چینی نے گھیر لیا، کئی بار ابھنو کو لے کر ہمارے بیچ تو تو میں میں ہونے لگی۔ رام کا شک بڑھتا رہا، زندگی جہنم سی لگنی لگی، زندگی جیسے زہر ہو گئی۔ تینوں کے منہ پر تالے لگ گئے۔ اس سے پہلے کہ جینا دشوار ہو جائے، میں نے بغیر کسی کو بتائے، اس گھٹن بھرے ماحول سے نکل کر، پاس کے دوسرے

چھوٹے گاؤں میں نئے سرے سے ناری شالا میں پناہ لے کر وہی بس جانے کا انتظام کر لیا۔ لیکن جاتے جاتے ابھنو کو پتہ دے دیا۔

ابھی چار ماہ مشکل سے گزرے تھے کہ ابھنو نے لکھا۔" ممانی، رام کو خون کا کینسر ہو گیا ہے، لیکن وہ نہ تو دوا لینا چاہتا ہے اور نہ ہی آپ سے ملنے کا خواہش مند ہے۔" آگے مزید لکھا تھا۔'' میری وجہ سے آج تم وہاں بن واس بھوگ رہی ہو، اور ادھر ماموں بھی بہت دکھی ہے۔ اذیت بھرے دن گزار رہے ہیں۔ تمہارے ذکر پر بہت خفا ہو جاتے ہیں اور وہاں سے اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ صورت حال یہ بنی ہے کہ نہ تو میں کچھ کر سکتا ہوں اور نہ تم۔ پر میں خود کو گنہگار ضرور سمجھتا رہتا ہوں۔ نہ جانے کیوں آپکے خوشیوں بھری دنیا میں میرا قدم نامناسب ثابت ہوا ہے۔ آپ گھر ہوتے ہوئے بھی بے گھر ہو گئیں۔ باقی سب خیریت ہے۔۔ ابھنو "

تار ہاتھ میں تھا اور ہاتھ کی حالت ایسی تھی کہ اس کاغذ کو پکڑنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ میں حساب کرنے لگی، آج رام کو گزرے چھٹا دن ہوا۔ چار دن کے بعد انہیں میری یاد آئی۔ درشن کا وقت تو نکل گیا۔ میرے بغیر سب کچھ ہو گیا ہے، اب کیا اس گھر کی اجڑی دیواریں جا کر دیکھوں؟ اور پھر نئے سرے سے گاؤں والوں کو اس رشتے پر کیچڑ اچھالنے کی وجہ بنو۔ جو اپنا تھا وہی اپنے نظریے سے پرکھ بیٹھا، اب اسکے نہ ہونے پر کسی بھی بات کا کوئی بھی مطلب نہ رہا۔ سب بیکار۔۔ بندھن ٹوٹ گئے۔۔۔!

رام تو جیسے سبھی جنجالوں سے نجات پا گیا، جیتے جی ترغیب کے سبھی ناطے توڑ گیا تھا۔ اسکے زندگی کے ساتھ سب کچھ ختم سا ہو گیا۔ سوچتے ہوئے، تھکے ہارے قدموں سے میں کھاٹ پر جا کر بیٹھی۔ لگا کچھ بدن سے نکل گیا ہے۔۔۔ اسی حالت میں، یوں ہی بے سدھ سی دو دن پڑی رہی۔۔۔!

دل سے بیمار، بدن سے لاغر۔۔۔ نڈھال۔۔۔!

اور تیسرے دن سورج کی روشنی کے ساتھ اٹھی، ہاتھ میں چائے لی، دو گھونٹ لئے ہی تھے کہ اسی دوران دروازے کی گھنٹی بجی۔ پیالی وہیں رکھ کر دروازہ کھولنے کے لئے بڑھی تو گھنٹی دوبارہ بجی اور پھر مسلسل بجتی رہی۔ بڑی مشکل سے آ کر دروازہ کھولا تو پوسٹ مین نے ایک تار ہاتھ میں تھما دیا۔

!یہ دوسرا تار تھا، پیغام وہی دکھ بھرا تھا۔ ”ابھنو کل دن کو اچانک گزر گیا۔ اسے برین ٹیومر تھا“۔۔۔بجاج

یہ کیا سے کیا ہو گیا؟ کوئی کسی کا نہیں رہا۔ دیوار کی ایک اینٹ کیا گری کہ پوری کی پوری دیوار ہل گئی۔ آنکھوں کے !آگے دھند چھا گئی، جسم بے جان سا ہو کر زمین پر گر پڑا۔۔۔

☆☆☆

کفارہ

وہ ان پڑھ تھی۔ تعلیم کیا ہوتی ہے، اسکا بیج شاید بچپن سے اسکے کومل ذہن میں بویا ہی نہیں گیا، یا حالات نے ہی اجازت نہ دی۔ چھوٹے سے گاؤں کی، گونگی گائے سی یہ الہڑ، اناڑی سی لڑکی، کھیتوں میں کام کرتے ہوئے بڑی ہوئی۔ تونگری کیا ہوتی ہے، عیش و آرام کس چڑیا کا نام ہے۔ اسے معلوم ہی نہ تھا۔ مزدوری کرنا، پانی بھرنا، مویشیوں کو چارہ ڈالنا اور دودھ دہی بازار میں جا کر فروخت کر آنا، یہی کام اسکے بس کا تھا۔

جس کے لئے وہ کام کرتی تھی، وہ اسکا کیا لگتا تھا، اسکا بھی اسے اندازہ نہ تھا۔ گاؤں کے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے منہ سے سنا تھا کہ جب وہ چار سال کی تھی تو اسکے ماں باپ گاؤں میں آئے سیلاب میں بہہ گئے اور وہ خود اس بندے کے پلے پڑ گئی۔ وہ تھا تو اسکے باپ کی عمر کا، لیکن غلیظ نظروں کا دھنی تھا۔ جیسے ہی وہ کچھ سمجھدار ہوئی تو اسے لگا کہ پیر سن کی چھیدتی نگاہیں، اسکے جوان بدن کو چیر کر آر پار ہوتے ہوئے اسے برہنہ کرتی رہتیں۔ وہ جب سولہ سال کی ہوئی تو اسے گاؤں کے مندر میں لے جا کر پنڈت کو گواہ بنا کر اپنی بیوی بنا کر گھر لے آیا۔ گاؤں کے لوگوں سے "گرہ

لکشمی" کہہ کر تعارف کروادیا۔ تعارف کیا تھا، اسکی بیوی ہونے کا خود ساختہ اعلان تھا۔ وہ کچھ بھی نہ تھی، لیکن اب گرہ لکشمی سے لکشمی بن گئی۔

کائنات کی تخلیق کا اہم ترین اصول، شاید اسی ایک رشتہ ازدواج کی بنیاد پر کھڑا ہے۔ انسان اور جانوروں کے درمیان، بس ایک یہی فرق رہا ہے کہ انسان اپنی سہولت کے مطابق، ریتی رواجوں پر عمل کرتا ہے اور اسے دھرم یا مذہب کا نام دے دیتا ہے، باقی کسی بھی قسم کی لکشمن ریکھا کو پار کرنے میں، وہ کسی جانور سے قطعی کم نہیں۔ ایسے خیال لکشمی کے ذہن میں اکثر و بیشتر پیدا ہوتے، جب بھی وہ اسکے ساتھ حیوانوں جیسا برتاؤ کرتا، اسکے جسم کو گوشت کے لوتھڑے کی طرح روندتا، اسکے ساتھ ہم بستری کرتا۔ یہ احساس تب زور پکڑنے لگا، جب وہ ماں بنی۔ جب مونا پیدا ہوئی تو وہ مزید مصروف رہنے لگی۔ تین سالوں کے بعد موہن پیدا ہوا۔ اب لکشمی کچھ کچھ عزت و احترام کی تعریف سمجھنے لگی۔ مونا کے سامنے اپنے شوہر کے منہ سے مغلظات سنتی تو توہین کی آگ میں جھلسنے لگتی۔ وہ اپنی بے عزتی اتنی مرتبہ کرواچکی تھی کہ عزت کیا ہوتی ہے، یہ احساس بھی اسکی لغت میں متروک ٹھہرایا گیا تھا۔ بس بیاں ہوتی تھی حالت، جب وہ آدمی شراب پی کر، مدہوشی میں جھومتے ہوئے گھر آتا اور تاریک رات کے ڈھل جانے پر دن کی روشنی میں صرف لکشمی کے بدن کے نیلے نشان ہی اس سچ کو ظاہر کرتے۔

اسی طرح کچھ سال مزید بیتے اور دیکھتے دیکھتے مونا دس سال کی ہو گئی۔ گو کہ وہ باپ سے ڈرتی تھی، لیکن ماں کے لئے اسکے دل میں ہمیشہ ایک نرم گوشہ رہا۔ گاؤں کے اسکول میں پڑھتی تھی۔ کبھی جب پڑھا ہوا ماں کے سامنے دوہراتے ہوئے کہتی، "ماں ماسٹر نے بتایا کہ ظلم کرنے والا گنہگار ہے، لیکن ظلم کو سہنے والا بھی اس سے بڑا گنہگار ہے، کیا یہ سچ ہے، یا فقط کتابوں میں درج ہے؟"

"مونا ماں سے یہ سوال بار بار پوچھتی، "ماں تم کیوں کچھ نہیں کہتی، کیوں چپ چاپ سہہ لیتی ہو؟

۔۔۔۔" ماں کی خاموشی واحد جواب ہوتی۔"

ماں کچھ تو کہو۔“ مونا پھر پوچھتی۔”

بس سوال خود کو بار بار دوہرا تا رہا۔ لکشمی جواب دے تو کیا؟ وہ رو کر سہے، یا چلا کر سہے، خاموش رہے یا شکایت کرے، خود کو بانٹے نہ بانٹے، کیا فرق پڑتا؟ ظلم تو ظلم ہے، ایک کرتا جائے، دوسرا سہتا جائے، شاید اس گھر کا یہی اصول بن گیا۔ اسکے پاس اور کوئی چارہ ہی نہ رہا۔ اب تو وہ دو بڑے بچوں کی ماں بھی تھی۔ خاموشی میں اپنی غنیمت سمجھ کر چپ رہتی۔

....

مونا اور موہن دونوں نے ماں کی کوکھ سے جنم تو لیا، لیکن کبھی پالنے میں جھول نہ پائے تھے۔ انہوں نے کبھی ماں کی پیار بھری لوری نہیں سنی۔ سنی تو بس، باپ کی کڑکتی ہوئی آواز یا اسکے لوہے جیسے ہاتھوں سے ماں کے نازک بدن پر کڑکتی بجلیوں جیسی مار کی آواز۔ وہ چھوٹے تھے، پر اتنے بھی چھوٹے نہیں کہ وہ یہ بھی نہ سمجھ پائیں کہ انکی ماں پر ظلم ہو رہا ہے۔ لیکن وہ دونوں بے بس اور مجبور ہے۔ جانتے تھے، ہر روز رات کو جب انکا باپ گھر میں گھستا، تو کس طرح ماں سہمی سہمی سی اپنا چہرہ ململ کی چنری سے ڈھانپ کر، کھاٹ کے کونے پر ایک پوٹلی کی طرح بیٹھی ہوئی ہوتی اور انکے آتے ہی اٹھ کھڑی ہوتی۔

”جاو□ کیا کھڑی ہو؟ اب اس طرح ۂ □ آو لے پانی پاپڑ ۂ ایک اور بنیان ایک فقط کر بدل کپڑے وہ اور “۔۔۔

برسوں پرانی لنگی پہن کر اسی کھاٹ پر لیٹ جاتا۔ کبھی تو گھر میں گھستے ہی گالیوں کی بوچھار شروع کر دیتا۔” نہ جانے میں کیسے اس جنجال میں پھنس گیا ہوں؟ بس میں ایک ہی کمانے والا اور تم تینوں بیٹھ کر کھانے والے۔ تم کیوں نہیں گی تو پتہ چل جائے گا کہ کام کرنا کیا ہوتا ہے؟ مزدور کا پسینہ بہانا کیا معنیٰ ۂ کچھ ہاتھ پیر چلاتیں؟ چار پیسے کماو□ رکھتا ہے؟ نکموں کی طرح روٹی پکا کر، روٹی کھا کر، بالکل بے حس سی ہو گئی ہو۔“

لکشمی ایسے زہریلے لفظ سننے اور جھیلنے کی عادی ہو گئی تھی، آج نہیں، پچھلے دس سالوں سے۔ ایک کہاوت ہے "نئی دلہن نو دن، زیادہ سے زیادہ دس دن "لیکن لکشمی کو تو دس دن بھی نئی نویلی ہونے کا سکھ نصیب نہ ہوا تھا، سہاگن کے سارے ارمان دھرے کے دھرے رہ گئے۔ ملا تو فقط یہ چولہا چوکا، وہی جھاڑو پوتا، جیسے یہی اسکی وراثت ہو۔

کبھی کبھی مونا اور موہن آپس میں آنکھوں کی خاموش زبان میں میں بولتے۔ ایک دن لکشمی کو اتنی مار پڑی کہ اسے تیز بخار چڑھ گیا۔ اسکے شکستہ بدن سے جیسے کسی نے جان کھینچ لی۔ کھٹیا پر بغیر ہلے ڈلے پڑی کراہتی رہی۔ مونا اب چھوٹی نہ رہی تھی، بارہ سال کی ہو گئی تھی۔ وہ پریشان نظروں سے ماں کی جانب دیکھتے ہوئے کہنے لگی، " بھگوان کرے ایسے باپ سے باپ نہ ہو تو ہی اچھا ہے۔"

اس بات کو ایک ہفتہ گزر گیا۔ حالات نے نہ سدھرنے کی ٹھان لی۔ زخم بھرنے کا نام ہی نہ لیتے۔ حکیم سے دوا لاکر باپ نے مونا کو دیتے ہوئے کہا، "یہ ماں کے زخموں پر لگا دو، جلدی ٹھیک ہو جائینگے، اور دوا دودھ کے ساتھ پلا دینا۔"

مونا کا غصہ ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ ظلم سہنے کی بھی حد ہوتی ہے۔ پہلی بار باپ کے سامنے ظلم کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے کہا، '' ٹھیک ہو جائے گی، پھر کیا؟ پھر مار کھائے گی، پھر گرے گی، پڑے گی، کراہتی رہے گی۔ اور پھر مرہم لگانے پر اٹھ کھڑی ہو گی، پھر سے مار کھانے کے لئے! اس سے بہتر یہ ہے کہ آپ اسے ایک ہی بار اتنا ماریں کہ وہ مر جائے، اور اس اذیت سے نجات پالے۔ مجھے تو یاد نہیں آتا ہے کہ میں نے کبھی ماں مسکراتے ہوئے دیکھا ہے، یا کبھی اس گھر میں عزت و احترام پاتے ہوئے دیکھا ہے۔ اسکے ساتھ تو ہمیشہ بدی کا رویہ رکھا گیا ہے اور کرنے والا کوئی اور نہیں، آپ ہی ہیں۔ زور آور کے آگے کمزور کا کیا بس چلے گا؟ اسے پڑی رہنے دو، پڑے پڑے مر جانے دو۔"
کڑواہٹ کا زہر اگلنے کے بعد، وہ رونے لگ گئی۔ موہن چھوٹا تھا، لیکن تھا تو اسکا بھائی۔ اپنی دونوں بانہیں بہن کے گلے میں ڈال کر اسے خاموش کرانے لگا۔

اسکے باپ کے تو جیسے ہوش اڑ گئے۔ اندر ایک بجلی کوندی، کچھ لرزش سی ہوئی اور کچھ بھر بھرا کر ٹوٹتا، گرتا محسوس ہوا۔ لکشمی کی حفاظت کے لئے دو مضبوط بانہیں ہیں۔ اب لکشمی کمزور نہیں۔ ایک دن یہ بانہیں اتنی مضبوط ہو جائیں گی کہ وہ اس پر وار کرتے ہوئے ہتھیار کو بھی تھام لیں گی۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ خود لکشمی کا محافظ نہیں، اسکو کھانے والا بن گیا ہو، اپنے گھر کو خود ہی آگ لگانے والا ایک عفریت۔ آج اس نے اپنے دل کے آئینے میں اپنا بدصورت عکس دیکھا اور اسے خود سے نفرت ہونے لگی۔ آنکھیں بھر آئی۔ مایوسی میں امید کی ایک کرن نمودار ہوئی۔ وہ اٹھا، ہاتھ منہ دھو کر رسوئی گھر میں گیا، تھوڑی کھچڑی پکائی، تھالی میں لے کر مونا کے سامنے آکر کھڑا ہوا۔

"یہ اپنی ماں کو کھلاو۔" کہتے ہوئے آنکھیں شرم سے نیچے زمین میں گاڑے، وہ کھڑا رہا۔ اسکی آنکھیں نم تھیں۔

"آپ ہی جا کر اسے کھلاو۔" بے رخی کے ساتھ مونا نے جواب دیا۔ اندر ہی اندر مونا آگاہ تھی۔ اسے پتہ تھا کہ یہ کفارے کے آنسو ہیں، جو اسکے باپ کی آنکھوں میں تیر رہے تھے۔ لیکن وہ کفارے کی انتہا دیکھنا چاہتی تھی۔ کفارہ اور معافی دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ باپ نے تھالی اٹھائی اور لکشمی کی کھاٹ کے آگے جا کھڑا ہوا، اس احساس سے بے خبر کہ لکشمی آنسو بہاتے بہاتے سو گئی تھی۔ دمکتے موتی سے آنسو بھی اسکے گالوں پر ہی سو گئے تھے۔

اب مونا سے رہا نہ گیا، اٹھ کر اپنے باپ کے پاس آکر کھڑی رہی۔ انکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جیسے ان سے کوئی وعدہ لیا اور پھر ماں کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر دھیرے سے کہا، "اٹھو ماں، اٹھ کر کھچڑی کھاو، بابا نے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہے۔"

لکشمی نے آنکھیں کھولیں۔ شوہر کو اپنے سامنے پایا، انسانیت لئے ایک نیا روپ۔ اٹھنے کی ناکام کوشش کی، پھر نقاہت کے سبب آنکھیں موند کر یوں ہی لیٹی رہی۔

تم لیٹی رہو، میں تمہیں چمچ سے کھلاتا ہوں۔" کہہ کر اس نے ایک چمچ کھچڑی کا بھر کر لکشمی کے منہ کی طرف بڑھایا" اور لکشمی کے منہ کھولنے کا انتظار کرنے لگا۔ لکشمی نے کھچڑی کھائی اور ساتھ میں اپنے آنسوؤں کا پانی بھی پیا۔ کھانے پینے کا سواد امرت جیسا لگا۔ آنکھیں کھول کر شوہر کی طرف دیکھا، پھر بچوں کی جانب۔ مونا کے منہ پر مسکراہٹ کا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ باپ کی جانب دیکھ کر اسکے گلے میں اپنی بانہیں ڈالتے ہوئے کھنکتی ہنسی کے ساتھ بولی، ' 'بابا، کھچڑی "میں تو آپ نے نمک ڈالا ہی نہیں، پھیکی کھچڑی کیا خاک مزہ دے گی۔

سنتے ہی باپ کی چھلکتی آنکھیں زمین میں گڑھ گئیں۔ سبھی کے چہروں کی مسکراہٹ، ہنسی میں تبدیل ہوتے ہوتے قہقہے کی گونج بن کر چاروں جانب پھیل گئ !

☆☆☆

ایک میں، ایک وہ

ہاں وہ وہی تھی، جسے میں پندرہ سال سے لگا تار بھلانے کی کوشش کرتے ہوئے بھی، بھلا نہ پائی۔

سیاہ کوئلے جیسابدن، کسی ہوئی چمکتی جلد، کالے سیاہ چہرے پر دو بڑی بڑی آنکھیں، جو دور سے دو سفید چمکتی لائیٹیں سی لگتی تھیں، گیراج کے سامنے رکی کسی کھٹارا گاڑی کی جلتی بجھتی ہیڈلائٹس کی طرح۔ بالوں کا جوڑا، سر کے پیچھے، بے ترتیبی بھرے انداز سے ٹھونسا ہوا، اس پر دھاگوں میں عجلت سے پروئے کیسری پھول چاروں جانب لپٹے ہوئے۔

باندرہ سے تھانے تک ساتھ سفر کرتے دیکھا تھا اسے۔

میں لیڈیز کمپارٹمنٹ میں سیٹ کے کنارے بیٹھی، خود کو نیچے گرنے سے بچانے کی جدوجہد میں، کبھی اپنے پیچھے موجود "راڈ" کو پکڑتی، کبھی اسکے ساڑی کے پلو کو پکڑتی۔ کھنچاؤ لازمی تھا۔ یہ اسکے مڑنے اور مڑ کر میری طرف دیکھنے سے بخوبی عیاں تھا۔

سوری۔" میں نے اسکی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "

"-----"

وہ میری جانب دیکھتی رہی۔ پھر دھیرے دھیرے اسکی کجراری آنکھوں میں ایک درد بھری مسکان نے جنم لیا۔

میری نظر اب اسکی آنکھوں پر ٹک نہ پائی، نیچے اتر آئی اور دھیرے دھیرے اسکے چست، کسے ہوئے، جوان بدن سے ہوتے ہوئے اسکے پیٹ پر آرکی۔

وہ پیٹ سے تھی، یہ بات تو طے تھی۔ شاید ساتواں مہینہ ہوا ہوگا۔ اسکے انداز سے لگا کہ وہ اپنے کسی درد کی دوا پانا چاہتی تھی۔ کبھی آنکھیں میچ لیتی، تو کبھی ہونٹ بھینچ لیتی، کبھی داہنا ہاتھ سوتی ساڑی میں ڈال کر پیٹ کے ابھار پر پھیر لیتی۔

مجھے لگا وہ شروعاتی دردِ زہ کے آثار ہے، کیونکہ وہ بار بار اپنے دائیں پیر کو بائیں پیر پر رکھ کر زور سے دبا رہی تھی۔ میری نظر جب اسکے پیروں سے اٹھ کر اسکے چہرے کی جانب آئی تو پایا کہ اسکے ہونٹ زور سے بھینچے ہوئے تھے، آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ یہ طے تھا کہ اسے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ شاید درد جاگ اٹھا تھا، وہ بھی اس دیوانگی میں بھاگتی ہوئی فاسٹ ٹرین میں۔۔

عورت ہوں، جانتی ہوں یہ درد وقت بیوقت ہی آتا ہے۔ جب درد ایک نامعلوم خوشی کو جنم دینے کو آمادہ ہوتا ہے تو میٹھی میٹھی سی کسک کے ساتھ جسم میں لہریں پیدا کرتا ہوا، درد بھی اٹھتا ہے۔

"یہاں بیٹھ جاو□" میں نے اسکی ساڑی کا پلو کھینچتے ہوئے، اسکو اپنی جانب متوجہ کیا۔ وہ شاید اب درد کے سبب ز مڑنے کی حالت میں نہیں تھی، لیکن اسکی گردن کے خم سے اسکی جھکی آنکھوں میں ایک سوال تیرتا نظر آیا۔ جواب تھا میرے پاس۔ ایک غیر موزوں کیفیت میں ایک موزوں سعی کرنے کی کوشش، میرے اختیار میں تھی۔ پڑھا تھا کہیں۔ "کتنی اچھی بات ہے کہ دنیا میں بہتری لانے کے لئے، کسی کو بھی ایک لمحے کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ہے"۔

مجھے بھی نہیں تھی۔ اسی پل اپنی جگہ سے اٹھتے میں نے اسے بازو سے پکڑ کر بیٹھنے کی درخواست کی۔ وہ بیٹھ گئی ایک فرمانبردار بیٹی کی طرح۔ یہ اسکی بے چینی تھی۔ اب میں اسکی جگہ پر کھڑی، لگاتار اسکی طرف دیکھتی رہی۔ اسکے چہرے کے تاثرات پڑھتی رہی، اسکے بارے میں سوچتی رہی، جسے میں کسی بھی زاویے سے نہیں جانتی تھی۔ لیکن ایک نا معلوم وابستگی سی ہو گئی ان چند لمحات میں۔ جذبات سے بھری کیفیت میں شاید خاموشی نے بہت کچھ بانٹا، کچھ اس نے، کچھ میں نے۔ بن بولی نگاہوں کی زبان، بھی بہت کچھ کہہ جاتی ہے، یہ تب جانا جب اس نے بہت مشکل کے بعد، اپنی بانہوں کو آگے کرتے ہوئے دونوں ہاتھ اپنی گود میں جوڑ دیئے۔ صرف آنکھیں میری جانب ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ یہ اسکا "دھنیواد" کہنے کا انداز تھا۔

سب ٹھیک ہے نہ؟"" میں نے اسکے کندھے پر اپنے دائیں ہاتھ سے نرم سا دباؤ ڈالتے ہوئے پوچھ لیا۔ "

"-------"

بس اس نے بس میری طرف دیکھا، ہلکے سے اپنا سر ہلایا اور پھر سے جڑے ہوئے ہاتھوں میں حرکت آئی۔

میں سمجھ گئی، وہ پھر سے شکریہ ادا کر رہی ہے خاموشی کی زبان میں۔ میں نے اپنی توجہ اسکی جانب سے ہٹا کر کھڑکی سے باہر، بھاگتی دوڑتی ان عمارتوں کی سمت مرکوز کر دی، جو ٹرین کی رفتار کے باوجو مخالف سمت میں بھاگ رہی تھیں۔ زندگی میں آگے بھاگتے بھاگتے، کبھی شاید کھڑے ہو کر ہم یہ نہیں سوچتے کہ زندگی ہم سے کیا چھین رہی ہے؟

اچانک ٹرین رک گئی اور پایا کہ وہی میرا پڑاؤ تھا۔ میں ہڑبڑا کر دھکے دیتی ہوئی، اپنا راستہ بنا کر آگے بڑھی اور مجھے احساس ہوا کہ کوئی مجھے دھکے دے کر آگے بڑھنے میں مدد کر رہا ہے۔ جیسے ہی پیر پلیٹ فارم پر ٹکے تو دیکھا، وہ حاملہ عورت بھی لگ بھگ میرے ساتھ چپک کر کھڑی تھی۔ اسکی خاموشی سے مدد طلب کرتی آنکھیں میرے اندر تک اتر رہی تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکا، پر کہا کچھ نہیں۔ شاید ہمارے پاس لفظ ہی نہیں تھے، جو

ہم ایک دوسرے کو سمجھا سکیں۔ یہ میں بخوبی جان گئی تھی، کہ اپنا مدعا، زبان کے علاوہ بھی بیان جا سکتا ہے۔ میں نے دیکھا، وہ ہاتھ جوڑنے میں قاصر تھی، کیونکہ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ تھام رکھا تھا۔

عورت کا شعور بھانپ گیا۔ میں تیزی سے باہر کی سمت بڑھی اور وہ سست رفتار سے میرے پیچھے پیچھے۔ میں نے ایک ٹیکسی والے سے بات کی اور اسے اندر بیٹھنے کے لئے جب دعوت دی، تو وہ دو قدم پیچھے کی طرف ہٹی۔ میں دنگ رہ گئی، ۔۔۔ میں یہاں رکتی ہوں۔ ز اسکا ردعمل دیکھ کر۔ وہ ہاتھ کے اشارے سے مجھ سے گزارش کر رہی تھی۔ " تم جاو□ ۔" بار بار ہاتھ ہلا کر مطلع کر رہی تھی۔ ز جاو□ ز کوئی آنے والا ہے مجھے لینے۔۔۔ جاو□

میں ٹیکسی میں بیٹھی اور ٹیکسی میرے بتائے ہوئے پتے پر مجھے پہنچانے میں پہل کر رہی تھی۔ اب اسکے اور میرے بیچ کا فاصلہ بڑھ رہا تھا۔ کچھ پل پہلے کتنے پاس تھے ہم اور اب کتنے دور ہوئے جا رہے ہیں۔ میں سوچتی رہی اسکے بارے میں، جو اسے لینے آنے والا تھا۔ وہ وقت پر نہیں آیا، کیوں؟ شاید کوئی آنے والا ہی نہ تھا؟ کون جانے وہ کس مشکل کیفیت میں تھی یا اپنی جان بچا کر کسی سے پیچھا چھڑانے کے لئے اس لدی پھندی ٹرین میں چڑھ گئی تھی۔ الجھن بھری ذہنی کیفیت سے میں تب بھی گھری ہوئی تھی اور آج بھی۔

....

خیالات کی کڑی، جو برسوں پہلے ٹوٹی تھی، اچانک آج پھر جڑ گئی۔ وہ سامنے کھڑی تھی۔ وہی رنگ، وہی روپ، وہی آنکھیں۔ بھیڑ میں بھیڑ کا حصہ تھی، لیکن پھر بھی سب سے الگ۔ اس نے مجھے دیکھا، میں نے اسے۔ وہ رکی اور میں بھی رکی۔ اس نے اپنے قدم بڑھا کر خود کو میرے سامنے لا کر کھڑا کیا۔۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ زمین کی طرف جھکی، میرے پیروں کو چھوا اور دنڈوت پرنام کرتے ہوئے دائیں ہاتھ سے زمین کو کئی بار چھو کر وہی ہاتھ اپنے ماتھے پر پھیرتی رہی۔

"میں نے جھک کر اسے آشیر واد دیتے ہوئے کہا، "کیسی ہو تم؟

"اچھی ہوں، آپکی آشیر واد سے۔۔۔۔ "

میرا آشیر واد۔۔۔خوش رہو۔"میں جیسے بیہوشی سے ہوش میں آئی۔ "

تاثرات کی جگہ، اب زبان نے لے لی۔ علم زبان کے بارے میں میری سمجھ اب معدوم ہونے لگی۔

"ہاں آپ کا آشیر واد۔۔۔ "

وہ کیسے۔۔۔"میں خود کو سنبھالنے میں کوشاں تھی۔ اب حالت کچھ ایسی تھی کہ گونگا کہہ رہا تھا اور بہرہ سن رہا تھا۔"

ہاں، اماں اس دن آپ نے مجھے بچالیا۔ میرا شرابی شوہر مجھے مارڈالنے پر تل گیا تھا۔ اسے شک تھا کہ میرے پیٹ میں" بچہ اسکا نہیں، کسی اور کا تھا۔"کہتے ہوئے اس نے ایک لمبی سانس لی۔

میری سانس رکنے سی لگی۔ اتنی صاف ستھری واضح انداز میں، بیباکی سے کہی، اسکی آپ بیتی سنتے ہی میرا سر چکرانے لگا۔

ہے رام۔"میرے منہ سے بے اختیار ہی نکل گیا۔ "

اماں، اس دن آپکی ٹیکسی جیسے ہی آگے بڑھی، وہ بھی اسی ٹرین سے اتر کر، میرا پیچھا کرتے ہوئے آپہنچا۔ مجھے بالوں" سے کھینچتا ہوا، دھکے دیتا ہوا مارتے مارتے بے حال ہو رہا تھا۔ میں گرتی پڑتی رہی، ہاتھ جوڑ کر اسے یقین دلاتی رہی کہ وہ بچہ اسکا ہی ہے۔ لیکن اسکے سر پر خون سوار تھا اور اس نے حقیقت میں اس بچے کا خون کر دیا۔ اب میں بے اولاد ہوں، کیونکہ کوکھ میں پنپتے اپنے بچے کی حفاظت نہیں کر سکی۔ خود کو گنہگار سمجھ کر کر میں نے اپنے لئے سزا چنی۔ سب کچھ چھوڑ دیا، گھر، شوہر، پڑوسی، وہ لعنتوں بھری بدبودار بستی۔۔۔ اور آج آشرم میں بچوں کی دیکھ بھال میں اپنا زندگی

گزارتی ہوں۔نہ کوئی میرا اپنا ہے،نہ میں کسی کی۔بس وہ آشرم ہی میرا گھر ہے،اور وہاں رہنے والے لوگ میرا خاندان۔۔۔"

اتنا لمبا سفر طے کر آئی ہو۔۔۔۔۔؟" میں یہ فیصلہ نہیں کر پائی کہ مجھے آگے کیا کہنا چاہیۓ؟"

اماں، آپ کو بہت یاد کیا، بھگوان کو پرساد چڑھایا کہ ایک بار آپ کا درشن پھر سے مل جائے۔وہ تمنا بھی آج پوری ہوئی۔نمسکارم اماں۔" اتنا کہہ کر وہ جانے کے لئے مڑی۔

اری رک تو۔اپنا نام تو بتا۔" میں اس سے منسلک ہونے کی چاہ میں شرابور تھی۔"

نام،اب میرا کچھ بھی اپنا نہیں اماں۔نہ گھر،نہ گھر والا،نہ نام۔۔۔۔۔۔!بس اب میں صرف "اکّا" ہوں،ان یتیم بچوں کی آیا،جن کی خدمت کے لئے مقرر کی گئی ہوں۔انکی زبان سے آیا،اکّا کی پکار میرے کانوں تک جب پہنچتی ہے تو میں جی اٹھتی ہوں۔اماں۔"

لیکن تم تو۔۔۔"سوال میرے گلے میں ہی پھنس گیا۔"

"آپ یہی پوچھنا چاہتی ہے نہ کہ میں بول رہی ہوں۔۔۔"

"ہاں تمہاری باتیں سن کر حیران بھی ہوں اور خوش بھی۔"

اماں،اس دن بول نہ پائی،سکتے میں آگئی تھی اسکی باتیں سن سن کر۔کہتا تھا،زبان کاٹ لوں گا اگر زبان کھولی تو۔میں ڈر گئی،وہ درندہ ایسا بھی کر سکتا ہے،پینے کے بعد کہاں کس کو ہوش رہتا ہے۔"

کیا تمہارا شوہر اتنا شقی ہے کہ اپنی بیوی پر ہاتھ۔۔۔۔۔۔" میں ابھی پوری بات کہہ بھی نہ کر پائی کہ وہ بول پڑی۔"

اماں، اس نامرد کی یاد آتے ہی میں آج بھی گونگی ہو جاتی ہوں۔ اس کے غلیظ سوال کا غلط جواب دے دیا تھا اس " دن۔ بہت غصے میں بھر گئی تھی اسکے الزامات سن سن کر۔ جب اس نے پھر وہی الزام دوہرایا، " یہ بچہ میرا نہیں "ہے۔" تو دل کی اگلتی آگ نے کہہ دیا، " ہاں، ہاں یہ بچہ میرے یار کا ہے۔

بس پھر کیا تھا، اس نے آگے بڑھ کر مجھے دبوچ لیا۔ اپنی ٹانگوں اور ہاتھوں کی گرفت میں اور اپنے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی جلتی ہوئی بیڑی زبردستی میرا منہ کھول کر، میری زبان پر نہ جانے کتنی بار رکھی، میں بے زبان ہو گئی۔ بس اپنی آنکھوں سے لہو بہاتی رہی۔ اسکا غصہ اپنی من مانی کر کے جب ٹھنڈا ہوا تو وہ کچھ دیر کے لئے باہر نکلا۔ جانے کیا سوچ کر میں بھی مخالف سمت میں گھر سے گرتی پڑتی، بھاگ نکلی۔ کھولی سے کچھ فاصلے پر اسٹیشن ہے۔ اپنے بچاؤ کے لئے بھیڑ کا سہارا لے کر میں اس ٹرین میں چڑھ گئی، بنا سوچے کہ وہ کس سمت میں اور کہاں جا رہی ہے۔" کہتے ہوئے اس نے اپنی زبان باہر نکالی اور پھر فوراً ہی منہ بند کر لیا۔

میں نے دیکھا اس لال کالی زبان کو، جس پر جلنے کے گول زخم موجود تھے۔ میں سوچ رہی تھی 'کیا انسانیت اس حد تک بھی گر سکتی ہے؟ امکانات کی سرحد کا پتہ لگانے کے لئے آگے بڑھ کر ناممکن کے دائرے میں جانا ہوتا ہے، اس سچ کو قبول کرنے کے لئے۔ میں نے تو صرف دیکھا، اس نے جھیلا ہے، جیا ہے۔ حقیقت وہم نہیں ہو سکتی۔۔۔!

اسی حقیقت اور وہم کے مایاجال سے اسکی آواز مجھے باہر لے آئی۔

اماں، تب بھی میں آپکے سامنے تھی اور آپ میرے سامنے۔ پندرہ سال کے بعد آج بھی ہم ایک دوسرے کے " آمنے سامنے، میں آپکے ہر سوال کا سیدھا جواب ہوں اماں۔"

میں ساکت ہو کر رہ گئی۔ کیا انسانیت اپنی پہچان اتنی کھو بیٹھی ہے کہ اسے اپنے پن کی تعریف بھی یاد نہیں۔ اسکی کہی بات ذہن میں بار بار گونجتی رہی۔ " نہ کوئی میرا اپنا ہے، نہ میں کسی کی ہوں۔ بس وہ آشرم ہی میرا گھر ہے، اور وہاں "رہنے والے لوگ میرا خاندان۔۔۔

یہ وہی تھی، جس کا نام ہے اکّا اور وہی اکّا آج اپنی محنت سے پائی ہوئی پہچان اور عہدے کی وجہ سے بہت خوش و خرم ہے۔

اس سے مل کر میں بے حد خوش ہوں۔ اب اجنبیت کی سبھی دیواریں گر چکی ہیں۔ میرا اس سے اکثر ملنا ہوتا رہتا ہے۔ آشرم میں، آشرم کی دیگر تقریبات و تنظیمی کاموں میں۔ جہاں کہیں بھی وہ آنے کا بلاوا بھیجتی ہے، میں چلی جاتی !ہوں۔ پیار کا یہ نازک بندھن ہے، جس کا کوئی رنگ نہیں، کوئی نام نہیں

یہ وہی پیار ہے، جسکے لئے رومی نے لکھا ہے۔۔۔

پیار نے میرے دل کو گرفتار کیا "

میرے رونے نے پڑوسیوں کو رات بھر جگائے رکھا

اب، جب میرا پیار گہرا ہوا ہے

میرے رونے میں ٹھہراؤ آیا ہے۔

شاید

جب آگ بھڑک اٹھتی ہے، تو

!دھواں غائب ہو جاتا ہے

آسمانوں سے پرے، فطرت اور انسان کا اٹوٹ تعلق کی جسامت صاف صاف دکھائی دے رہی ہے۔

اختتام